GHAZANFAR KE AFSANOUN MEIN KHAWATEEN KE MASAIL

A dissertation submitted to the University of Hyderabad in partial fulfilment of the requirement for the award of the degree of

MASTER OF PHILOSOPHY

Submitted By

GULNARA KHATOON

Under the supervision of

Dr. RAFIA BEGUM

Department of Urdu, School of Humanities
University of Hyderabad
Hyderabad-500046

2019

غضنفر کے افسانوں میں خواتین کے مسائل

مقالہ برائے

ایم۔فل (اردو)

Reg. No: 18HUHL12

مقالہ نگار

گلنارا خاتون

نگراں

ڈاکٹر رفیعہ بیگم

شعبۂ اردو، اسکول آف ہیومانیٹیز

یونی ورسٹی آف حیدرآباد

حیدرآباد-500046

2019

DECLARATION

I Gulnara Khatoon hereby declare that this dissertation entitled **"GHAZANFAR KE AFSANOUN MEIN KHAWATEEN KE MASAIL"** submitted by me under the guidance and supervision of ***Dr. Rafia Begum,*** is a bonafide research work which is also free from plagiarism. I also declare that it has not been submitted previously in part or in full to this University or any other University or Institution for the award of any degree or diploma. I hereby agree that my dissertation can be deposited in Shodganga/INFLIBNET.

Date________________

Gulnara Khatoon

Signature of the Student

Reg. No. 18HUHL12

//Countersigned//

Signature of Supervisor

CERTIFICATE

This is to certify that the dissertation entitled **"GHAZANFAR KE AFSANOUN MEIN KHAWATEEN KE MASAIL"** bearing Reg. No. 18HUHL12 in partial fulfillment of the requirements for the award of Master of Philosophy in Urdu is a bonafide work carried out by her under my supervision and guidance.

This dissertation has not been submitted previously in part or in full to this or any other University or Institution for the award of any Degree or Diploma.

"Countersigned"

Signature of the Supervisor

Dr. Rafia Begum.

Head
Department of Urdu

Dean
School of Humanities

فہـــرست

پیش لفظ	2
باب اوّل: غضنفر کے حالات زندگی اور شخصیت	6
باب دوم: غضنفر کے ہم عصر افسانہ نگاروں کے افسانوں میں خواتین کے مسائل	35
باب سوم: غضنفر کے افسانوں میں خواتین کے مسائل	73
ماحصل	116
کتابیات	122

پیش لفظ

پیش لفظ

شروع کرتی ہوں خدائے پاک کے نام سے جو نہایت رحیم و کریم ہے۔ تمام تعریف اس رب العزت کی جس نے ہمارے آقا ﷺ کو دو جہاں کا رہنما بنا کر بھیجا۔ جن کے صدقے کے طفیل میں، میں آج اس تحقیقی مرحلہ تک پہنچی ہوں۔

تحقیق کا کام میرے لیے مشکل تھا اور اس سے زیادہ مشکل کام موضوع کا انتخاب تھا۔ پروفیسر حبیب نثار صاحب نے میرے لیے اس موضوع کا انتخاب کیا جو میرے لیے بہتر اور مفید ثابت ہوا۔

کوئی بھی تحقیق چاہے وہ ایم فل کی ہو یا پی ایچ ڈی کے مقالے کی حرف آخر نہیں ہوسکتی۔ کیوں کہ ہمیں ایک مقررہ وقت پر مقالہ کو پایہ تکمیل پر پہنچانا از حد ضروری ہوتا ہے۔ یہ ایک بڑا فکر انگیز مرحلہ ہوتا ہے۔ اس مرحلے میں نگراں ہی ہے جو ہماری ہمت اور حوصلے کو جلا بخشتا ہے اور ہماری بھرپور رہنمائی کرتا ہے۔ میں اس مرحلے میں با آسانی گزرنے میں کامیاب و کامران رہی کیوں کہ میری نگراں ڈاکٹر رفیعہ بیگم نے مجھے حوصلہ عطا کیا۔

دراصل میرا تعلق ریاست اڑیسہ سے ہے جہاں آج بھی کئی ایک مسائل حائل نظر آتے ہیں۔ علاقائی زبانوں اور خصوصاً اڑیا زبان کا ہی اثر ہے ایسے میں بہ حیثیت اردو ادب کی طالب علم میں نے بھدرک آٹونومس کالج، اڑیسہ سے ایم۔اے اردو کی تعلیم حاصل کی اور بعد ازاں میرا انتخاب یونی ورسٹی آف حیدرآباد میں بہ حیثیت ایم۔فل اسکالر کے ہوا۔ شہر حیدرآباد تو ابتدا ہی سے علم و ادب تہذیب و تمدن کے لیے نہ صرف ہندوستان بلکہ عالمی سطح پر اپنی انفرادیت کے لیے اپنی مثال آپ ہے۔ اس زرخیز علم و ادب سے مالا مال سرزمین سے میرا رشتہ بہ حیثیت ایم فل اسکالر جڑا اور الحمدللہ مجھے شعبۂ اردو نے پی ایچ

ڈی کے لیے سال رواں میں منتخب کیا جو میرے لیے اعزاز سے کم نہیں۔

بے شک تحقیق میں موضوع کا انتخاب بڑی اہمیت کا حامل ہوتا ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ کوئی بھی تحقیق حرف آخر نہیں کہلاتی اس میں ترمیم اور اضافے ہوتے رہتے ہیں لیکن جب ایک اسکالر اپنا مقالہ وقت مقررہ کی پابندی میں قلم بند کرتا ہے تو کئی ایک مسائل سے اسے دوچار ہونا پڑتا ہے۔سب سے بڑا اور اہم مسئلہ موضوع کے مطابق مواد کی فراہمی کا ہوتا ہے۔لیکن اگر نگراں کا خوشگوار ساتھ ہمیں مل جائے تو ہم اس مشکل کو بہ آسانی حل کر لے سکتے ہیں۔اس معاملے میں مجھے اپنی نگراں ڈاکٹر رفیعہ میڈم پر فخر ہے کہ انھوں نے مجھے مایوس ہونے نہیں دیا بلکہ یوں کہوں تو مناسب ہوگا کہ انھوں نے ابتدا سے لے کر مقالے کی تکمیل تک میری رہنمائی کی جس کی وجہ سے میرا مقالہ وقت مقررہ پر داخل ہو سکا۔میں میڈم کے لیے دعا گو ہوں کہ اللہ رب العزت انھیں ہمیشہ خوش و کامیاب رکھے۔

میں نے اپنے مقالے کو اپنی نگراں کے مشورے سے تین ابواب میں تقسیم کیا ہے۔پہلا باب غضنفر کے حالات زندگی اور شخصیت کا احاطہ کرتا ہے۔دوسرے باب میں غضنفر کے ہم عصر افسانہ نگاروں کے افسانوں میں خواتین کے مسائل کا جائزہ لیا گیا ہے اور مقالے کا تیسرا باب ایک اہم باب ہونے کے ساتھ ساتھ مقالے کا مرکزی باب کا درجہ رکھتا ہے۔اس باب میں میں نے غضنفر کے افسانوں میں خواتین کے مسائل کو تلاش کرنے کی ایک طالب علمانہ کوشش کی ہے۔بعدازاں ماحاصل کے عنوان سے مقالے کا مجموعی جائزہ لیا گیا ہے۔اس کے علاوہ کتابیات بھی شامل کی گئی ہیں۔

شکریہ اور احسان مندی کا پاس و لحاظ رکھنا صرف ایک رواج ہی نہیں بلکہ ہماری تہذیب کا ایک اہم حصہ ہے جس کی بدولت ہم کامیابی و کامرانی کی دشوار گزار منزلیں اپنے بزرگوں اور اساتذہ کی دعاؤں کی بدولت بہ آسانی حاصل کر پاتے ہیں۔

میں احسان مند ہوں اپنے والدین کی جنھوں نے مجھے ہمیشہ علم وادب کی دنیا میں آباد رہنے کا زریں موقع فراہم کیا۔ خاص کر میری والدہ صاحبہ نے مجھے ہمیشہ علم کی دولت اپنے دامن میں سمیٹنے کی نہ صرف نصیحت کی بلکہ اپنی ممتا بھری دعاؤں سے سرفراز کرتی رہیں۔ انھیں کی جستجو اور حوصلہ افزائی نے مجھے یونی ورسٹی آف حیدرآباد کی اسکالر بننے کے قابل بنایا۔ میں اپنے والدین کے لیے تاحیات احسان منداور دعا گو ہوں۔ میں اپنے بھائیوں اور بہنوں کی بھی ممنون ومشکور ہوں کہ ان کے خلوص ومحبت نے مجھے ہمیشہ ہمت اور حوصلہ بخشا۔

میں شکر گزاری کے تیئں شعبۂ اردو کے صدر پروفیسر حبیب نثار صاحب کی احسان مند ہوں جنھوں نے کورس ورک کے دوران ہمیں تحقیق وتنقید کی مشکل راہوں کو سمجھنے کی صلاحیتیں عطا کیں۔ صدر شعبۂ اردو کی شفقت ہمیشہ مجھے حاصل رہی جو میرے لیے ایک اعزاز سے کم نہیں۔

بعدازاں میں اپنی نگراں ڈاکٹر رفیعہ میڈم کی دلی گہرائیوں سے احسان مند ہوں اور شکر گزار بھی ہوں کہ جنھوں نے ہمیشہ میرا ساتھ دیا۔ شعبے کے دیگر اساتذہ کی بھی میں مشکور ہوں۔ میں اپنے تمام ساتھیوں کا شکریہ ادا کرتی ہوں اور خاص طور پر شیخ بدرالدین، اسماء شکیل، آبرو ریاض، نہاں نورین، شہزادہ شیخ، سہانہ بیگم، جمیل حسین اور ارشاد عالم اور اظہر جمال کی مشکور ہوں اور ان سب کے لیے دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ انھیں جزائے خیر عطا کرے۔

میں موجودہ عہد کے معروف فکشن نگار غضنفر علی کی بے حد ممنون ومشکور ہوں کہ جن کی افسانہ نگاری میرے مقالے کا عنوان ثابت ہوئی۔ پروفیسر غضنفر علی صاحب نے بذریعہ ٹیلی فون مجھے افسانوں کے متعلق رہنمائی فرمائی اور مجھ ناچیز کو ہمت اور حوصلہ بخشا اور دعاؤں سے سرفراز کیا۔

مقالہ نگار

گلنارا خاتون

باب اول

غضنفر کے حالات زندگی اور شخصیت

غضنفر کے حالات زندگی اور شخصیت

آباواجداد:

غضنفر علی جو موجودہ دور میں فکشن کا ایک مشہور نام ہے ان کے آباؤ اجداد کا تعلق بہار کے ضلع گوپال سے ہے۔ان کے والد کا نام عبدالعزیز تھا ان کی پیدائش گوپال گنج، بہار کے ایک گاؤں چوراؤں میں ہوئی۔ ان کی والدہ کا نام درودن تھا جو ایک نیک خاتون تھیں۔ نماز، روزہ کی پابند تھیں ان میں ہمدردی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی جسکی وجہ تھی کہ آس پڑوس کی عورتیں بھی ان کے پاس آ کر بیٹھتی تھیں اور مذہبی معلومات سے آگاہ ہوتی تھیں یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے بچوں کی تعلیم کی ابتدا مدرسہ سے کروائی۔ان کا کہنا تھا کہ بچوں کی تعلیم کی شروعات دینی تعلیم سے ہونی چاہیے۔اس لیے پہلے انھوں نے دینی تعلیم دینا زیادہ ضروری سمجھا۔اس کے بعد دنیاوی تعلیم کی طرف توجہ کی جس کے نتیجہ میں بچوں کی تعلیم میں اضافہ ہوتا گیا اور وہ اپنا نام روشن کررہے ہیں ان کے والد عبدالعزیز ایک تجارت پیشہ تھے۔جس کی وجہ سے وہ بہت مصروف رہتے تھے۔مگر اپنی ملازمت کی مصروفیت کے ساتھ ساتھ وہ اپنے بچوں کی تعلیم میں بھی ان کی رہنمائی کرتے تھے۔

بھائی بہن:

عبدالعزیز صاحب کی پانچ اولاد یعنی غضنفر کے چار بھائی بہن تھے۔ان کے دو بہن اور دو بھائی تھے جن میں سے دو لڑکیوں اور ایک لڑکے کی وفات ہو چکی ہے۔صرف دو اولاد ہیں جن میں غضنفر اور ان کے بھائی ڈاکٹر شمشاد علی ہی بقید حیات ہیں۔

ولادت:

جناب عبدالعزیز کے گھر 9/مارچ 1953ء کو وہ مبارک دن آیا جب غضنفر علی بہار کے ضلع گوپال گنج کے ایک گاؤں چوراؤں میں پیدا ہوئے۔ان کے والد نے غضنفر نام بہت پیار سے رکھا اور جسے گھر والوں نے بھی بہت پسند کیا۔آگے چل کر انھوں نے ادبی دنیا میں قدم رکھا تو غضنفر کے قلمی نام سے لکھنا شروع کیا اور خوب شہرت حاصل کی اور اب ادبی دنیا کے ایک نامور قلمکار کی حیثیت سے جانے اور پہچانے جاتے ہیں۔

تعلیم وتربیت:

عام طور پر جس طرح مسلم گھرانوں کے بچوں کو پہلے مدرسے کی تعلیم دی جاتی ہے اسی طرح غضنفر کی ابتدائی تعلیم مدرسے سے ہوئی لیکن مدرسے کی پابندی اور سختی سے وہ جلد ہی بیزار ہو گئے اور آگے کی تعلیم مکتب میں حاصل کی اس کے بعد پرائمری اسکول چوراؤں سے اپر پرائمری اسکول چھپرہ سیوان سے پانچویں پاس کرنے کے بعد میڈل اسکول ہمرا، گوپال گنج میں انھیں داخل کروایا گیا۔

سمیرا اسکول سے میڈل وی ایم پی ایچ سکنڈری اسکول گوپال گنج سے ہائر سکنڈری 1976ء میں اور گوپال گنج سے بی اے 1973ء میں کامیاب کرنے کے بعد انھوں نے علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں داخلہ لینا چاہا لیکن والد کی نظر میں علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کا (Image) اچھا نہیں تھا۔یہی وجہ تھی کہ انھوں نے بہار یونی ورسٹی مظفر پور میں مجبوراً داخلہ لیا۔مگر وہ اردو میں ایم اے علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے کرنے کی ضد برابر کرتے رہے۔پھر کچھ اس طرح اتفاق ہوا کہ ان ہی دنوں جے پی تحریک (جے پرکاش تحریک) نے زور پکڑا اور بہار یونی ورسٹی میں غیر معینہ مدت کے لیے تالا لگ گیا۔اس طرح غضنفر کے لیے علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں داخلہ لینا ضروری ہو گیا تھا۔

غضنفر علی کو علی گڑھ میں داخلہ مل گیا مگر والدین کی رضامندی کے بغیر علی گڑھ میں داخلہ لینا غضنفر کے لیے مالی پریشانیوں کا سبب بنا، اخراجات کے پیسے آنے بند ہو گئے لیکن جب پہلے سمسٹر میں سرفہرست رہے تو فطری طور پر والد محترم کا غصہ کم ہوا اور منی آڈروں کا سلسلہ پھر سے جاری ہو گیا۔ 1976ء میں امتیازی نشانات کے ساتھ ایم اے کامیاب کیا اور 1982ء میں ''شبلی نعمانی کے تنقیدی نظریات'' پر مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔

جب غضنفر علی نے علی گڑھ میں داخلہ لیا تو پہلے وہاں بہت اچھے اچھے استاد موجود تھے۔ غضنفر ذہین اور حساس طبیعت کے مالک تھے اس لیے انھیں استاد بھی بہت اچھے ملے۔ ان استادوں میں کچھ ایسے استاد بھی تھے جو غضنفر کے علم میں بے پناہ اضافہ کیے۔

غضنفر جب علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں تعلیم حاصل کر رہے تھے تو ان کی قابلیت کی بنا پر اساتذہ سے بھی ان کے اچھے تعلقات ہو گئے تھے۔ جن اساتذہ نے غضنفر کے علم میں ذوق و شوق پیدا کیے اور ان کی علمی و ادبی صلاحیتوں کو بلندیوں تک پہنچایا ان اساتذہ میں شہر یار کا نام سرفہرست ہے۔ شہر یار سے ان کو بہت قربت تھی اس بات کو غضنفر نے خود لکھا ہے کہ ایک روز استاد شہر یار نے کہا ''چلیے آج کوئی فلم دیکھ آتے ہیں تو حیران رہ گئے'' چنانچہ اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے غضنفر لکھتے ہیں:

> ''استاد کی طرف سے فلم کا آفر پا کر میں ہکا بکا رہ گیا میں نے کبھی کسی کہانی میں بھی نہیں سنا تھا کہ کسی استاد نے اپنے شاگرد کو فلم دکھائی ہو۔ میں اس ماحول سے آیا تھا جہاں استاد اور شاگرد کا رشتہ تقریباً حاکم اور محکوم جیسا ہوتا ہے یا ایک روایتی باپ اور بیٹے کا سا۔ جہاں شاگرد استاد کے سامنے صرف کھڑا رہتا ہے وہ بھی ہاتھ اور منہ دونوں باندھ کر مگر میں اس شخص (یعنی

اپنے استاد) کے ہمراہ رکشے پر اس کی بغل میں بیٹھ کر سنیما ہال گیا۔ پکچر کے
ساتھ ساتھ کھانا کھایا اور سگریٹ بھی پی لی'' ۱؎

اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ غضنفر کی شخصیت کی تعمیر میں ان کے اساتذہ کا بھی اہم رول رہا ہے کیوں کہ غضنفر کی تعلیم جس ماحول میں ہوئی تھی وہ پوری طرح روایتی تھا اور پھر علی گڑھ آنے کے بعد استاد کا اپنے شاگرد سے محبت و شفقت کے ساتھ ایک دوستانہ سلوک نے انھیں بہت متاثر کیا اور پھر استاد کی جانب سے دی گئی آزادی نے انھیں ایک اچھا تخلیق کار بننے کا بھی موقع فراہم کیا۔

شہر یار سے غضنفر کے تعلقات آہستہ آہستہ بڑھنے لگے اور وہ اپنے استاد کے ذاتی معاملات میں بھی مشورہ کرنے لگے اور ضرورت پڑنے پر شہر یار نے ان کی بھر پور مدد بھی کی ہے ایک واقعہ کے حوالے سے غضنفر نے بتایا کہ ان کے والدان کی شادی سے ناراض تھے تو کسی طرح ان کے استاد محترم شہر یار نے ان کی مدد فرمائی وہ لکھتے ہیں:

''میری شادی کی تاریخ طے ہو چکی تھی میرے والد کسی ناراضگی کے سبب
شریک نہیں ہو پا رہے تھے جس کی وجہ سے میں بہت پریشان تھا تو استاد کو
جب معلوم ہوا تو وہ خود میرے پاس آئے اور بڑے ہی جذباتی لہجے میں
بولے میں آپ کے والد کی جگہ تو نہیں لے سکتا مگر اتنا ضرور یقین دلاتا ہوں
کہ شادی میں ان کی کمی آپ کو محسوس نہیں ہوگی'' ۲؎

شہر یار اپنی تمام تر مصروفیات کے باوجود ایک دن میں 16 گھنٹے کا سفر طے کر کے شادی میں شرکت کی یہی نہیں بلکہ وہ تمام فرائض جو ایک والد کی اپنے بیٹے کی شادی میں ہوتے ہیں وہ پوری ذمہ داری سے ادا کیے۔ ان کے علاوہ گوپی چند نارنگ اور بہت سے لوگوں نے شادی میں شرکت کی۔ گوپی چند

نارنگ بھی غضنفر کے محسن ہیں اور انھوں نے بھی غضنفر کی بہت مدد کی ہے انھوں نے یہ مدد کسی غرض یا لالچ کی بنا پر نہیں کی بلکہ غضنفر کی شخصیت میں نکھار پیدا کرنے کے لیے کیا تھا۔ اس بات پر غضنفر بے حد متاثر ہوئے اور ایک مضمون اپنے محسن گوپی چند نارنگ پر لکھا جس میں انھوں نے ان کی مبالغہ آمیز تعریفیں کی ہیں چنانچہ ڈاکٹر کمالی لکھتے ہیں:

''گوپی چند نارنگ غضنفر کے محسن ہیں انھوں نے آڑے وقتوں میں ان کی بہت مدد کی چنانچہ جب انھوں نے اپنے محسن پر عقیدت مندانہ مضمون لکھا تو اس میں اپنے قلم کی ساری طاقت جھونک دی۔ دکھانے کو انھوں نے دوستی اور پیار، اظہار، کردار، علم وافکار، اقتدار واختیار، رموز واسرار، پیار اور وقار کا رنگ دکھایا ہے لیکن ان کے امتزاج سے انھوں نے رنگوں کا جو ایثار تیار کیا ہے اس میں ان کی ممدوح کی شخصیت پنہائی ہوئی نظر آتی ہے۔ عقیدت کی روشنی اتنی تیز ہے کہ آنکھیں خیرہ ہوجاتی ہیں اور نارنگ عام انسانی سطح سے اتنے بلند نظر آنے لگتے ہیں کہ انھیں دیکھنے کے لیے قاری کو آخری حد تک اپنی گردن بلند کرنی پڑتی ہے جن کے علوم وکمال کے نقش ونگار کو دیکھ کر عصائے سامری ٹھٹھک جائے۔ ہنر ادومانی رنگ رہ جائیں جن کے رموز و نکات کے آگے افلاطون وارسطو کو حیرانی ہو جن کی فصاحت وبلاغت کو دیکھ کر سخن دان فارس بھی دم سادھ لیں، تحسین وتعریف کی آنکھیں کھلی رہ جائیں''

۳

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ غضنفر گوپی چند نارنگ کی شخصیت سے کس قدر متاثر تھے اور ان

کی ہمدردی نے ان کو اپنے استاد کی قدر تعریف کرنے پر مجبور کیا۔

مشاغل:

غضنفر کے مشاغل میں لکھنا پڑھنا، اپنے طلبا کی تدریس کرنا اور ان کی جس حد تک ہو سکے مدد کرنا اور رہنمائی کرنا ہے۔ اس کے ساتھ اپنے تمام تر مصروفیات کے باوجود سمیناروں اور کانفرنسوں میں شرکت کرنا بھی شامل ہے۔ غضنفر کی ایک سب سے بڑی اور اچھی عادت رہی ہے کہ جب ان کے ذہن میں کوئی موضوع آتا ہے تو وہ اس موضوع کے بارے میں بہت دیر تک اور ہر زاویے سے سوچتے ہیں اور بڑے غور وفکر کرنے کے بعد کسی ناول یا افسانے کی تخلیق کرتے ہیں۔ یہی عادت نے ادبی دنیا میں انھیں نمایاں مقام عطا کیا۔ شروع شروع میں غضنفر میں سگریٹ نوشی کی عادت بھی تھی۔ لیکن بعد میں کسی وجہ سے انھوں نے سگریٹ نوشی ترک کردی اور اب چائے پینے کی عادت غالباً ہوگئی۔

غضنفر کو موسیقی سے بھی دلچسپی ہے جس کی جھلک ہمیں ان کے افسانوں اور ناولوں میں بھی نظر آتی ہے نثر میں بھی وہ شاعری سے زیادہ کام لیتے ہیں اور زبان وبیان میں انھیں قدرت حاصل ہے۔ اس کی مثالیں تقریباً ان کے تمام تخلیقات میں دیکھنے کو ملتی ہیں۔

ملازمت:

غضنفر طالب علمی کے زمانے سے ہی بے حد فعال اور سرگرم رہے۔ انجمن اردو معلیٰ کے سکریٹری اور علی گڑھ میگزین کی مجلس ادارت کے ممبر کی حیثیت سے ان کی کارکردگی قابل تحسین ہے۔ 1982ء میں یونین پبلک سروس کمیشن کے انٹرویو میں بے دلی سے شریک ہوئے اور کامیاب ہوکر وزارت تعلیم وسماجی بہبود حکومت ہند کے ایک لسانی ادارے سنٹرل انسٹیٹیوٹ آف انڈین لنگویجز میسور سے منسلک ہوگئے اور تقریباً گیارہ سال اردو ٹیچنگ اینڈ ریسرچ سنٹر سولن (ہماچل پردیش) میں بحیثیت لکچرر کم جونیئر ریسرچ

آفیسر کے عہدے پر فائز رہے۔ 1993ء میں یونین پبلک سروس کمیشن کے ذریعہ منتخب ہوکر اردو ٹیچنگ اینڈ ریسرچ سنٹر کی لکھنؤ شاخ میں پرنسپل کا عہدہ سنبھال لیا۔

علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد انھیں علی گڑھ یونی ورسٹی ہی میں ملازمت کرنے کا شوق بھی تھا۔ خدا نے ان کی مدد کی وہ 1997ء میں علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے ایک انٹرویو میں شرکت کی اور بحیثیت ریڈر شعبۂ اردو میں ان کا تقرر عمل میں آیا۔ تین سال تک وہاں درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے۔ مگر ریڈر کی وہ پوسٹ مستقل نہیں تھی۔ اس لیے دوبارہ اپنے سابقہ عہدے پر لکھنؤ لوٹ آئے اس واقعہ کا ذکر پروفیسر علی احمد فاطمی نے بڑے شگفتہ انداز میں یوں کیا ہے:

> ''عملی زندگی میں غضنفر سے ایک چوک بھی ہوگئی علی گڑھ کی تعلیم وتربیت نے انھیں مدرس ہونے کی چاہ تو پیدا کر ہی رکھی تھی علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے وابستہ ہونے کی خواہش بھی دبی ہوئی تھی جو ایک خاص موقع پر ابھری اور ایک موقع ملا تو وہ اپنی پختہ ملازمت اور پرنسپل شپ چھوڑ کر عارضی طور پر شعبۂ اردو میں ریڈر ہوگئے۔ لیکن ڈھائی تین سال گزر جانے کے بعد بھی وہ جب وہاں مستقل نہ ہوئے یا نہیں ہونے دیا گیا تو مجبور ہوکر انھیں واپس مستقل طور پر آنا پڑا لیکن اس درمیان انھوں نے علی گڑھ میں اپنا مکان بنوالیا اور بیوی بچوں کو بھی مستقل کردیا۔ ڈھائی تین سال کا یہ واقعہ ایک تلخ احساس کی طرح ان کے سینے میں اٹک گیا۔ لیکن اچھی بات یہ ہوئی کہ وہ اپنی واپسی پر رنجیدہ نہیں ہیں بلکہ خوش ہیں اور خوب کام کررہے ہیں۔ پھر بھی یہی خیال ہے کہ یہاں رہ کر جتنا کام کرسکیں علی گڑھ میں رہ کر نہیں کرسکتے تھے اس کی

وجہ یہی ہے کہ غضنفر کی سادگی اس کی شریفانہ سوچ اخلاقانہ اپج سولن شملہ جیسی وادیوں میں تو گل کھلاسکتی ہے علی گڑھ میں نہیں علی گڑھ میں وہ رہتے تو صرف شاعر ہوتے لیکن اس میں بھی وہ عبید صدیقی ہوتے نہ اسعد بدایونی۔ البتہ مہتاب حیدر نقوی کی طرح ضرور ہوجاتے۔ اچھے شاعر اچھے دوست اور اچھے انسان لیکن گوشہ نشین آج جو ایک افسانہ نگار اور ناول نگار کی حیثیت سے اس کی شہرت ہندو پاک کی سرحد کو چھورہی ہے۔ شاید وہ مقدر میں نہ ہوتی اور اردو کا نیا ناول اور افسانہ کے قابل ذکر افسانوں اور ناولوں میں یقیناً محروم رہتا۔ اس بات کا احساس غضنفر کو علی گڑھ کے پہلے طویل قیام میں ہوا ہو یا نہ ہوا ہو۔ اس ڈھائی تین سال کی مدت میں ضرور ہوگیا۔ اس لیے اب جہاں وہ خوش اور مطمئن ہیں اور اس کے میرے جیسے احباب بھی خوش اور مطمین ہیں'' [4]

لکھنؤ سے ان کا تبادلہ دہلی جامعہ ملیہ میں ہوگیا۔ ابھی جامعہ ملیہ میں پروفیسر اور ڈائرکٹر کے عہدہ پر ہیں اپنے کاموں کو ذمہ داری کے ساتھ پورا کررہے ہیں اور ساتھ ساتھ بحیثیت ایک تخلیق کار کے بھی اپنی خدمت انجام دے رہے ہیں۔

شادی:

غضنفر کی شادی 2 رستمبر 1979ء کو بشریٰ علی سے ہوئی۔ ان کی شادی کی تاریخ اس وقت طے ہوئی جب ان کو ملازمت ملی اور جس وقت ملازمت ہاتھ سے جانے لگی تو شادی کی تاریخ روک دی گئی تھی کیوں کہ شادی طے ہونے کی ایک بڑی وجہ ان کی ملازمت تھی اس لیے ان کے ختم ہوتے ہی اچانک

شادی کی تاریخ میں توسیع ہوگئی۔اس وقت غضنفر عجیب طرح کی الجھن میں مبتلا تھے۔اپنی ذہنی کیفیات کو انھوں نے افسانوی انداز میں یوں بیان کیا ہے:

''فکر نے ذہنوں کو آدبوچا وسوسوں نے سر اٹھایا اور اندیشوں نے ایسا دباؤ ڈالا کہ الٹی سوچ شروع ہوگئی اس سے پوچھا گیا بلکہ اسے سمجھایا گیا کہ رشتہ توڑ دینا یا شادی کو ملتوی کردینا مناسب ہوگا مگر اس نے کسی بھی بات کے لیے حامی نہیں بھری اس کے اس رویے میں اس کی شرافت کا دخل تھا یا محبت کا یا اس کی دور اندیشی اور ذہانت کا یہ کہنا مشکل ہے۔ہاں یہ کہنا مشکل نہیں ہے کہ اس کے فیصلہ میں میرے اس سبق کا ہاتھ ضرور تھا جسے میں نے صدق دل سے پڑھا تھا۔دل جمعی سے یاد کیا تھا اور بار بار لکھ کر دکھایا تھا'' ۵؎

بشریٰ علی نہایت سلیقہ مند، محبت کرنے والی اور وفا شعار شریک حیات ہیں اس طرح کی لڑکی سے شادی کر کے غضنفر نے صحیح فیصلہ لیا تھا کیوں کہ عین پریشانی اور بے روزگاری کے عالم میں نجیب آباد کے سادات گھرانے کی خوش شکل اور اس سے زیادہ خوش کردار و گفتار لڑکی بشریٰ علی سے انھوں نے صرف دیوانہ وار عشق ہی نہیں کیا بلکہ پوری ایمانداری اور سچائی اور سادگی کے ساتھ شادی بھی کی۔اس میں غضنفر کی شرافت اور سچے جذبۂ عشق کا تو دخل تھا ہی کم و بیش ہی کیفیت اور خصوصیت ان کی بیوی بشریٰ علی میں بھی تھی۔وہ ایک اچھی بیوی اور بہترین ماں ثابت ہوئیں۔

وہ دوسروں کا خیال رکھنے میں کوئی کمی نہیں کرتیں۔اپنے بے گانے، پڑوسی متعلقین سبھی کا خیال رکھتی ہیں ۔ ہر ایک کا احترام کرتی ہیں ۔ ہر ایک سے خلوص و محبت سے ملتی ہیں ہر ایک کی ضرورت اور خواہش کی تکمیل کی کوشش کرتی ہیں اسی لیے ان سے عزیز و اقارب ، دوست احباب ، پڑوسی سبھی خوش

رہتے ہیں۔اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ نہایت سلیقہ مند بھی واقع ہوئی ہیں۔غضنفر کے ایک دوست خورشید احمد بشریٰ علی کی سلیقہ مندی کے بڑے مداح ہیں۔انھیں جب کبھی موقع ملا بشریٰ علی کی خوب تعریف کرتے ہیں ایک جگہ وہ ان کی خوش سلیقگی کی ستائش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ایک مرتبہ ہم (غضنفر) کلکتہ گئے میں تو وہاں سے اپنے لیے ڈھیر ساری چیزیں لایا''ٹی میٹ''لائی اپنے لیے آرائش وزیبائش کے سامان خریدنے کے بجائے گھر کے لیے اس کاٹی میٹ خریدنا خورشید صاحب کو اتنا پسند آیا کہ وہ اس کے اس وصف کے شیدائی ہوگئے جہاں کہیں سگھڑپے کا ذکر آتا ہے تو بے ساختہ ان کے لبوں پر اس کا نام آجاتا ہے'' ۶؎

غضنفر کی ازدواجی زندگی نہایت کامیاب رہی ان کی اہلیہ بشریٰ علی ایک سیدھی سادی گھریلو دیندار خاتون ہیں۔ان کی شخصیت بہترین اخلاق کی حامل ہیں وہ اپنے شوہر کا بے حد خیال رکھتی ہیں اور ان کی بے پناہ مصروفیتوں میں بھرپور تعاون دیتی ہیں۔

ازدواجی زندگی:

غضنفر اور بشریٰ علی کی ازدواجی زندگی بڑی خوشگوار رہی ہے۔اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ ہر کامیاب شخص کی کامیابی کے پیچھے کسی عورت کا ہاتھ ہوتا ہے یہاں بھی یہ بات بالکل درست معلوم ہوتی ہے کیوں کہ غضنفر کی کامیابی کے پیچھے ان کی بیگم بشریٰ علی کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔خوشگوار زندگی کے لیے لازمی ہے کہ گھر کا ماحول بھی خوشگوار رہے۔بشریٰ علی نے شوہر کو پرسکون ماحول فراہم کیا ان کے لکھنے پڑھنے میں بھرپور تعاون دیا اور گھریلو ذمہ داریوں کو خود سنبھالا اور اپنے شوہر کو ہر طرح کی ذمہ داری سے مستثنیٰ رکھا اس طرح کا پرسکون ماحول غضنفر کو ایک کامیاب اور مقبول ناول نگار بننے میں مددگار رہا۔غضنفر بھی اپنی اہلیہ سے بے

حد محبت کرتے ہیں اور ان کی ہر خواہش کی تکمیل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور ان کی شریک حیات بھی ان کا بڑا خیال رکھتی ہیں۔ چنانچہ غضنفر لکھتے ہیں:

''ہماری شادی کے تقریباً 26 سال ہو چکے ہیں مگر آج تک میں نے اپنا رومال تک نہیں دھویا کبھی اپنے کپڑوں پر پریس نہیں کی، میں نے کبھی اس کی فکر نہیں کی کہ مجھے کب کیا پہننا ہے کہاں کس لباس میں جانا ہے کس پینٹ کے ساتھ کون سی شرٹ پہننی ہے کس سوٹ کے ساتھ کون سی ٹائی باندھنی ہے یہ سارے کام وہ کرتی ہے۔ میں اکثر سفر میں رہتا ہوں مگر وہاں بھی اس کے دھلے اور پریس کیے ہوئے کپڑے پہنتا ہوں۔ وہ میرے لیے ہر وقت تین تین سوٹ کیس تیار رکھتی ہیں ایک وہاں کے لیے جہاں میں نوکری کر رہا ہوتا ہوں، دوسرا سفر کے لیے اور تیسرا گھر کے لیے یہ معمول تقریباً 26 سال سے چلا آ رہا ہے۔ اس کا ایک معمول میرے سفر کے متعلق اور بھی ہے اور وہ ہے گھر سے نکلتے وقت دعا پڑھ کر مجھ پر دم کرنا دعا پڑھنے اور دم کرنے کا سلسلہ اس وقت بھی نہیں روکتا جن دنوں کسی کشیدگی کے سبب ہمارے درمیان کا زبانی رابطہ ٹوٹ چکا ہوتا ہے'' ۷

ایک ذمہ دار بیوی کی طرح غضنفر کی شریک حیات ان کے پڑھنے لکھنے کے کاموں میں بھی رہنمائی کرتی ہیں وہ اردو نہیں جانتی ہیں لیکن پھر بھی ضرورت کے وقت وہ ان کی جس حد تک ممکن ہو سکے رہنمائی کرتی ہیں۔ انھیں اردو پڑھنا نہیں آتا تھا اس کے باوجود بھی وہ اردو اچھی طرح بول لیتی ہیں شاید اس لیے کہ وہ اہل زبان ہیں اور اردو انھیں وراثت میں ملی تھی۔ غضنفر خود اس سلسلے میں کہتے ہیں کہ:

''اس نے با قاعدہ اردو نہیں پڑھی مگر وہ مجھ سے اچھی اردو جانتی ہے بولنے میں اس سے بھولے سے بھی کوئی غلطی نہیں ہوتی شاید اس لیے کہ وہ اہل زبان ہے اور اردو اسے وراثت میں ملی ہے اپنی تحریروں کا مسودہ اسے دکھا کر مجھے اطمینان ہو جاتا ہے جب بھی کسی لفظ کے املا پر اٹکتا ہوں تو اس کی رہنمائی میری مشکل آسان کر دیتی ہے'' ۸؎

عام طور پر جو عورت کی سب سے بڑی خوبی ہوتی ہے کہ وہ اپنے خلوص و محبت سے سب کا دل جیت لیتی ہے اور ہر مصیبت و تکلیف کو ہنس کر برداشت کر لیتی ہے۔ان کے اندر یہ بھی خوبی ہے کہ سنگین سے سنگین مصائب کو بھی ہنس کر جھیل لیتی ہیں۔کسی بھی صورت حال میں کبھی بھی ان کا توازن نہیں بگڑتا۔ وہ اپنا آپا نہیں کھوتی یہی وجہ ہے کہ ثابت قدمی سے سارے مسائل کا حل تلاش کر لیتی ہیں اور صبر و تحمل سے مصائب کا سامنا کرتی ہیں اس طرح سے غضنفر کی ازدواجی زندگی نہایت خوش گوار اور کامیابی کے ساتھ رواں دواں ہیں۔

اولاد:

غضنفر کی دو اولادیں ہیں ایک لڑکی اور ایک لڑکا ہے۔لڑکی کا نام شہنا ہے اور لڑکا کا نام فرحان ہے۔لڑکی اس وقت پیدا ہوئی جب غضنفر بے روزگار تھے اور لڑکا اس وقت پیدا ہوا جب غضنفر خوشحالی کی زندگی گزار رہے تھے۔بچوں کی تعلیم و تربیت میں ان کی شریک حیات بشریٰ علی کا اہم رول ہے۔ان دونوں نے ایم بی بی ایس کامیاب کیا ہے۔چنانچہ غضنفر بشریٰ علی کی اس خصوصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''وہ خستہ حالی میں ماں بنی مگر اپنی بچی کو اس طرح پالا اس حد تک سعی کیا کہ

بے بی شو میں ہماری بچی ہزاروں بچوں میں انعام کے لیے چن لی گئی۔ بچہ
خوش حالی میں جنما اور بیٹی کے بعد پیدا ہوا مگر خوشیوں کے اظہار میں اس نے
ایسا کچھ نہیں ہونے دیا جس سے توازن بگڑ تا ہے اور چھچلے پن کا رنگ
جھلکتا ہے'' 9

بچوں کی تعلیم و تربیت میں والد اور والدہ دونوں کا اہم رول ہوتا ہے لیکن بچے اپنی ماں سے زیادہ قریب ہوتے ہیں اس لیے ماں کا اثر بچوں پر بھی پڑتا ہے اگر ماں تربیت یافتہ ہوتی ہے تو وہ اپنے بچوں کو بھی ویسا ہی بنانے کی کوشش کرتی ہیں۔ چنانچہ بشریٰ علی نے اس میں بھی اپنا کمال دکھایا ہے۔ بشریٰ علی کا اپنے بچوں کی تربیت میں زیادہ دخل رہا ہے لیکن غضنفر بھی اپنی اولاد کا بڑا خیال رکھتے ہیں ان کے ساتھ بڑی محبت اور شفقت کا برتاؤ کرتے ہیں اور ان کی ضرورتوں کا خیال رکھتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج وہ ایک کامیاب اور خوشحال زندگی گزارر ہے ہیں۔

سماجی وفلاحی خدمات:

غضنفر ابتدا ہی سے ہمدردانہ مزاج رکھتے ہیں دوسروں کی تکلیف میں شریک ہوتے ہیں ہمیشہ اپنے سے پہلے دوسروں کا سوچتے ہیں اور ہمیشہ یہ کوشش کرتے ہیں کہ ان کی وجہ سے کسی کو تکلیف نہ ہوں ان کے اندر ہمیشہ یہ جذبہ رہا ہے کہ ہماری قوم آگے بڑھے وہ کہتے ہیں کہ اردو داں طبقہ خود اردو زبان کی قدر نہیں کرتا ان کا یہی خیال ہے کہ اردو پڑھنے کے بعد ملازمت حاصل کرنا دشوار ہوتا ہے اسی خیال کو ذہن میں رکھتے ہوئے انھوں نے اردو ٹیچنگ اینڈ ریسرچ سنٹر میں ملازمت بعض اہم پروفیشنل کورس اردو زبان جاننے والوں کے لیے قائم کیے۔ جس سے باآسانی ملازمت حاصل کی جاسکتی تھی غضنفر کی کوششوں کو سراہتے ہوئے شہریار کہتے ہیں:

''اردو ٹیچنگ اینڈ ریسرچ سنٹر کو انھوں نے اردو کے سلسلہ سے خاص اہمیت دلائی ہے ان کا جو پروفیشنل کام ہے کافی اہم ہے بہت ایسے کام جو انھوں نے اپنے ورکشاپ کے ذریعے سے کیے ہیں وہ بڑی یونی ورسٹیوں کو کرنا چاہیے تھا۔ IAS امتحانات کی تیاری کرنی ہے تو اس کے لیے کورس میٹریل تیار کیے جائیں یہ غضنفر نے ہی سوچا ادارے کی طرف سے پورے نصاب کے لیے ضروری مواد تیار کرایا۔ ایسے بہت سے کام ہیں جن پر انھوں نے کافی توجہ کی ہے ان میں ایک خوبی اور بھی ہے کہ لوگوں کا تعاون حاصل کر لینا کافی دور دور سے لوگ ان کے ورکشاپ میں آتے ہیں۔ ان کو علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے بھی جامعہ ملیہ سے بھی تعاون مل جاتا ہے وہ جس ادارے سے چاہتے ہیں وہ ادارے تعاون دیتا رہا ہے میں تو ان کی اور زیادہ کامیابی کی دعا کرتا ہوں'' [10]

غضنفر کی صلاحیتوں کو سبھی لوگ سراہتے ہیں ان کی صلاحیتوں کو مدنظر رکھ کر جس اداروں سے تعاون حاصل کرنا چاہا ان اداروں نے ان کی بھرپور حوصلہ افزائی اور مدد کی اسی طرح اردو زبان کو فروغ دینے کے لیے انھوں نے دل و جان سے کوشش کیں۔

حلقۂ احباب:

غضنفر کا حلقۂ احباب کافی وسیع ہے ان کی شخصیت سے ہر کوئی متاثر ہوتا ہے ایک بار ان سے ملنے کے بعد اکثر لوگ ان کے گرویدہ ہو جاتے ہیں۔ اس طرح ان کے جاننے والوں اور دوستوں کا حلقہ کافی وسیع ہے۔ اس حلقہ میں بلاتفریق ہر مذہب و ملت ہر طرح کے لوگ شامل ہیں۔ غضنفر اپنی انسان

دوستی ،خلوص،محبت، مساوات، رواداری،شفقت، اخلاقی اقدار وحسن وسلوک سے بزرگوں و دوستوں کے حلقہ میں بے حد عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ان کے دوستوں کے حلقے میں ادیب، شاعر اور نقاد بھی شامل ہیں۔ان میں چند اہم نام یہ ہیں: جاوید حبیب، شارق ادیب،فرحت احساس، ابوالکلام قاسمی،خورشید احمد، پیغام آفاقی،نسیم صدیقی، طارق چھتاری، اظہار ندیم،آشفتہ چنگیزی، مہتاب حیدر نقوی،نظیر چشتی، پرویز جعفری،منظور ہاشمی،ابن کنول،سید محمد اشرف،محی الدین اظہر،کفیل احمد،غیاث الرحمٰن، سید عبدالرحیم،قدوائی، سہیل جذبی، عقیل صدیقی، انجن زیدی،تصدق حسین، آصف نعیم، مرزا مسعودعلی بیگ،محفوظ عالم،شاہد پرویز،محمد امین،محمد زاہد،سید معراج، یونس اسلم،صغیرافراہیم،فرحت العین رضوی،عبدصدیقی، اسعد بدایونی،مہر عالم،عمر عالم وغیرہ ہیں۔

ادبی سفر:

غضنفر کی ادبی زندگی کا آغاز اس وقت ہوا جب وہ ہائر سکنڈری میں تھے اسی وقت گوپال گنج میں ایک مشاعرہ ہوا اس میں ایک مصرع طرح دیا گیا اور یہ کہا گیا تھا کہ لوگ اس پر غزلیں لکھیں تو غضنفر نے بھی کوشش کی اور اس مشاعرے میں ایک غزل سنائی۔انھیں بعض اشعار پر خوب داد بھی ملی۔اس طرح ان کی ادبی زندگی کا آغاز گوپال گنج میں منعقد اس مشاعرے سے ہوا جو 69-1968 کے عرصے میں ہوا تھا۔

غضنفر کی پہلی تخلیق نثر میں ''کوئلے سے ہیرا'' نام کا ایک ڈرامہ ہے جوانھوں نے 1971ء میں لکھا۔ یہ ڈرامہ اتنا مقبول ہوا کہ اسے اسٹیج بھی کیا جا چکا ہے۔ یہ ڈرامہ پہلے ہندی زبان میں بال کلیان پریس پٹنہ سے شائع ہوا۔اسی سال 1971ء میں اردو میں اسی نام سے شائع ہوا۔شاعری انھوں نے بعد میں شروع کی لیکن علی گڑھ جانے کے بعد شاعری کی طرف ان کا جھکاؤ زیادہ ہوگیا اور تواتر سے نظمیں،

غزلیں لکھنے لگے اور مختلف رسائل و جرائد میں ان کا کلام چھپنے لگا۔

عام طور پر نوجوان تخلیق کار شاعری کی طرف پہلے راغب ہوتا ہے بعد میں نثر کی طرف اس کا رجحان ہوتا ہے لیکن غضنفر کے ساتھ ایسا نہیں ہوا۔ انھوں نے پہلے کہانیاں لکھیں پھر شاعری کی طرف متوجہ ہوئے۔ ان کی تخلیقی کاوش نظم اور نثر دونوں میں ایک ساتھ جاری رہیں۔ اسی دوران ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ''مشرقی معیار نقد'' کے عنوان سے 1978ء میں شائع ہوا۔ یہ ان کے ابتدائی دور کی تخلیق ہے۔ شاعری کی طرف زیادہ توجہ انھوں نے اس لیے کی تھی کہ اس زمانے میں شعر و شاعری کا زیادہ چرچہ تھا۔ چند برسوں بعد اچانک ان کا رجحان شاعری سے زیادہ فکشن کی طرف ہونے لگا۔ اس کا بڑا سبب یہ تھا کہ ان کے ناول ''پانی'' کی پذیرائی توقع سے زیادہ ہوئی اور صرف اس ایک تخلیق نے دنیائے ادب میں ان کی ایک پہچان بنا دی جب کہ درجنوں شعری تخلیقات کی اشاعت کے باوجود ان کی کوئی خاطر خواہ پذیرائی نہ ہوسکی تھی۔

عرض کہ ''پانی'' کی غیر معمولی شہرت نے غضنفر کو ناول نگاری کی طرف مزید متوجہ کیا۔ پھر تو انھوں نے ایک بعد کے دیگر کئی ناول لکھے جن میں موضوع کی ندرت اور تازگی بیان کی بدولت یہ ناول بھی ''پانی'' ہی کی طرح مقبول ہوئے۔ ان کے ناولوں میں ''کینچلی'' 1993ء، ''کہانی انکل'' 1997ء، ''دویہ بانی'' 2000ء، ''فسوں'' 2003ء، ''وش منتھن'' 2004ء، ''مم'' 2007ء، ''شوراب'' 2009ء، ''مانجھی'' 2012ء خاص طور پر اہمیت رکھتے ہیں۔ لیکن ناول نگاری کی ان تمام شہرتوں کے باوجود وہ شاعری اور افسانہ نگاری دونوں سے دور نہیں ہوئے اور ناول نگاری کے پہلو بہ پہلو افسانہ نگاری اور شاعری کی طرف برابر متوجہ رہے۔ غضنفر کے افسانوں کے مجموعے ''حیرت فروش'' 2005 اور ''پارکنگ ایریا'' 2016ء کے عنوان سے شائع ہو چکے ہیں۔ ان نثری تخلیقات کے ساتھ ساتھ وہ شاعری

کی طرف بھی راغب ہوئے۔جن میں ''آنکھ میں لکنت''2015ء،مثنوی ''کرب جاں''2016ء بچوں کی نظموں کا مجموعہ ''سخن غنچہ'' کے نام سے 2015ء اور ''خوش رنگ چہرے''2018ء میں منظر عام پر آچکے ہیں۔اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے لکھنے کی رفتار بہت تیز رہی ہے۔ چنانچہ پروفیسر صفدر امام قادری ان کی تخلیق کی تیز رفتاری کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''غضنفر اردو کے ان تخلیق کاروں میں سرفہرست ہیں جن کے لکھنے کی رفتار تیز تر ہے۔''پانی'' کی 1989ء میں اشاعت سے ان کی تخلیقی سلسلے پر توجہ دیں تو معلوم ہوگا کہ گزشتہ اٹھارہ برسوں میں انھوں نے سات ناول پیش کیے۔ افسانے،تنقید،خاکے اور تدریس کے تعلق سے ان کی تحریریں اس سے الگ ہیں''پانی'' سے تقریباً دو دہائی قبل سے وہ شاعری کے کوچے کی سیاحی میں بھی مبتلا ہیں اور ادب بھی متواتر غزلیں اور نظمیں سامنے آتی رہتی ہیں۔خدا نے انھیں جو تخلیقی قوت عطا کی اس کے استعمال میں غضنفر نے بخل سے کام نہیں لیا اور خاصے فیاضانہ انداز میں انھوں نے اظہار کی باتیں پھیلائیں۔شاعری میں اسے قدرت کا کلام کہتے ہیں جسے آپ غضنفر کی تخلیقی شخصیت کا سب سے بڑا عنصر تصور کر سکتے ہیں'' [11]

غضنفر کو عام طور پر ایک ایسے نثر نگار کی حیثیت سے پہچانا جاتا ہے جسے افسانوی نثر میں استعاراتی اور علامتی زبان کے ساتھ ساتھ مختلف انداز کے اسلوبیاتی خاکے تیار کرنے کا ہنر بھی آتا ہے۔ ان کے ناولوں میں ایک شاعرانہ لے بھی ابھرتی ہے۔غضنفر کی تخلیقی صلاحیتوں کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان کے ناولوں اور افسانوں میں شاعری اور انشا پردازی کے عناصر بخوبی نظر آتے ہیں۔اس کے

علاوہ انھوں نے خاکے کی صنف میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ان کے خاکوں کے دو مجموعے ''سرخ رو'' 2010ء اور ''روئے خوش رنگ'' 2015ء منظر عام پر آ چکے ہیں۔ ایک مجموعہ ''خوش رنگ چہرے'' ابھی زیر طباعت ہے۔ اس کے علاوہ لسانیات کے میدان میں بھی انھوں نے بہت کام کیا ہے اور ایک استاد کی حیثیت سے وہ پچھلے پینتیس برسوں سے درس و تدریس سے وابستہ بھی رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ''لسانی کھیل'' کے عنوان سے درس و تدریس کی ایک کتاب ترتیب دی ہے۔ تحقیق و تنقید میں بھی غضنفر نے نمایاں کام انجام دیے ہیں۔

تصانیف:

غضنفر کی اب تک تصنیف و تالیف کی ہوئی درج ذیل کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں:

(1) کوئلے سے ہیرا	(ڈرامہ)	1971
(2) مشرقی معیار نقد	(تنقید)	1978
(3) پانی	(ناول)	1989
(4) کینچلی	(ناول)	1993
(5) کہانی انکل	(ناول)	1997
(6) دویہ بانی	(ناول)	2000
(7) زبان و ادب کے تدریسی پہلو	(تنقید)	2001
(8) فسوں	(ناول)	2003
(9) وش منتھن	(ناول)	2004
(10) تدریس شعر و شاعری	(تنقید)	2005

(11) حیرت فروش	(افسانوی مجموعہ)	2005
(12) مم	(ناول)	2007
(13) لسانی کھیل	(درس وتدریس)	2007
(14) شوراب	(ناول)	2009
(15) سرخ رو	(خاکوں کا مجموعہ)	2010
(16) مانجھی	(ناول)	2012
(17) فکشن سے الگ	(تنقیدی مضامین کا مجموعہ)	2013
(18) روئے خوش رنگ	(خاکوں کا مجموعہ)	2014
(19) پارکنگ ایریا	(افسانوی مجموعہ)	2015
(20) آنکھ میں لکنت	(شعری مجموعہ)	2015
(21) سخن غنچہ	(شعری مجموعہ)	2015
(22) مثنوی کرب جاں	(مثنوی)	2016
(23) خوش رنگ چہرے	(خاکوں کا مجموعہ)	2018

ہندی میں کتابیں:

(1) دویہ بانی

(2) کہانی انکل

زیر طبع تصانیف:

(1) شبلی نعمانی کے تنقیدی نظریات (تحلیقی مقالہ)

(2) جدید طریقۂ تدریس (درس و تدریس)

(3) خوش رنگ چہرے (خاکوں کا مجموعہ)

اعزازات وانعامات:

(۱) تخلیقی ذہانت ایوارڈ (نیا سفر اردو میگزین، دہلی)

(۲) ناول ''پانی'' پر اتر پردیش اور بہار اردو اکادمی کا انعام

(۳) ناول ''کینچلی'' پر اتر پردیش اردو اکادمی کا انعام

(۴) ناول ''کہانی انکل'' پر اتر پردیش اردو اکادمی کا انعام

(۵) ناول ''دویہ بانی'' پر بہار اردو اکادمی کا انعام

(۶) ''تدریس شعر وشاعری'' پر اتر پردیش اردو اکادمی کا انعام

(۷) ''حیرت فروش'' پر اتر پردیش اردو اکادمی کا انعام

شخصیت:

شخصیت کا مطالعہ محض ظاہری خصوصیات اور خدوخال کی بنا پر نہیں کیا جا سکتا ہے۔ بلکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ فرد کے عام ظاہری اور باطنی اوصاف کا مجموعی مطالعہ کیا جائے اور ان کے درمیان ایسے توازن کی نظر رکھی جائے جو کسی معاشرے یا گروہ میں فرد کا کردار اور کار منصب متعین کرتے ہیں جس سے ایک شخص دوسرے شخص پر اپنے تاثرات چھوڑتا ہے اور اپنی عادات کو ظاہر کرتا ہے۔ ایک ہی والدین سے پیدا ہونے والے بچے مختلف شخصیتوں کے مالک ہوتے ہیں۔ حالانکہ ان کی پیدائش و پرورش یکساں ماحول میں ہوتی ہے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ شخصیت اصل انسان کی داخلی و خارجی خصوصیات کے مجموعے کا نام ہے۔

حلیہ:

غضنفر کی وضع قطع اور عکس جمیل کچھ اس طرح ہے۔ سانولا سلوٹا رنگ، دراز قد، مناسب جسم، بڑی بڑی آنکھیں، بھنویں گھنی، لمبی ناک، بڑی بڑی مونچھیں اور داڑھی منڈھی ہوئی، کتابی چہرہ، سر کے بال سفید کانوں تک ڈھکے ہوئے، لہجہ تیز غرض غضنفر دیدہ زیب شخصیت کے مالک ہیں۔ ان سے ملنے کے بعد کوئی بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ غضنفر کے حلیے پر روشنی ڈالتے ہوئے علی احمد فاطمی ان کے بالوں کی تعریف اس طرح کرتے ہیں:

> ''ایک سانولا سلوٹا چہرہ غضنفر کی شخصیت کا سب سے پر کشش چہرہ اس کے سر کے بال تھے گھنے بھرے بھرے کالے اور لمبے بال تو خیر ہمیشہ ہی بند کیے گئے لیکن مردوں کے بالوں کا کان تک ڈھکے رہنا اس زمانے کا فیشن تھا۔ ہم سب اس کوشش میں رہتے ہیں لیکن اس فیشن کی زینت اور سعادت غضنفر کے حصے میں زیادہ آئی تھی'' ۱۲

غذا:

غضنفر کو اچھے کھانے کا شوق لیکن ان کا ماننا ہے کہ خدا کی بھیجی ہوئی کوئی نعمت خراب نہیں ہوتی اور ہر چیز جو اللہ نے کھانے کے لیے دی ہے وہ خوب سے خوب تر ہوتی ہے۔ مگر ان کی پسندیدہ غذا آلو کی سبزی اور کباب ہے اور پھلوں میں آم، انگور زیادہ پسند کرتے ہیں۔ پہلے سگریٹ نوشی بھی کرتے تھے لیکن کسی وجہ سے اب سگریٹ پینا چھوڑ دیا ہے۔ چائے شوق سے پیتے ہیں۔

لباس:

غضنفر شائستہ و نفاست پسند طبیعت رکھتے ہیں مزاج کی نفاست ان کے لباس سے بھی جھلکتی

ہے۔ وہ مشرقی ومغربی دونوں طرح کے لباس پہنتے ہیں جب وہ دفتر جاتے ہیں تو زیادہ تر شرٹ اور پتلون پہن کر ہی جاتے ہیں چھوٹے چھوٹے چیک والی شرٹ زیادہ پہنتے ہیں اور جب گھر پر رہتے ہیں تو زیادہ تر کرتا اور پاجامہ میں رہتے ہیں لباس کی صفائی کا وہ خاص طور پر خیال رکھتے ہیں اصل میں ان کے لباس کا خیال سب سے زیادہ ان کی بیوی رکھتی ہیں غضنفر خود اس سلسلے میں کہتے ہیں:

> ''ہماری شادی کے تقریباً 26 سال ہو چکے ہیں مگر آج تک میں نے اپنا رومال تک نہیں دھویا کبھی اپنے کپڑوں پر پریس نہیں کی، میں نے کبھی اس کی فکر نہیں کی کہ مجھے کب کیا پہننا ہے کہاں کس لباس میں جانا ہے کس پینٹ کے ساتھ کون سی شرٹ پہننی ہے کس سوٹ کے ساتھ کون سی ٹائی باندھنی ہے یہ سارے کام وہ کرتی ہے۔ میں اکثر سفر میں رہتا ہوں مگر وہاں بھی اس کے دھلے اور پریس کیے ہوئے کپڑے پہنتا ہوں۔ وہ میرے لیے ہر وقت تین تین سوٹ کیس تیار رکھتی ہیں ایک وہاں کے لیے جہاں میں نوکری کر رہا ہوتا ہوں، دوسرا سفر کے لیے اور تیسرا گھر کے لیے یہ معمول تقریباً 26 سال سے چلا آرہا ہے۔ کبھی اس میں کوئی کوتاہی یا کمی نہیں ہوئی'' ۱۳؎

معمولات:

غضنفر کے معمولات زندگی یہ ہے کہ وہ صبح صادق سے ہی جاگ جاتے ہیں اور نماز کے بعد تھوڑی دیر تلاوت کلام پاک کرتے ہیں اس کے بعد تھوڑی دیر ورزش کرتے ہیں۔ غضنفر کی تندرستی وچستی کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ وہ ورزش پابندی سے کرتے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد نہا کر تیار ہو جاتے ہیں اور ناشتے کے بعد یونی ورسٹی کے لیے روانہ ہوتے ہیں اور جامعہ اسلامیہ دہلی میں اپنی دفتری مصروفیت میں

رہتے ہیں اور خالی وقتوں میں کچھ لکھنے پڑھنے کا کام بھی کرتے رہتے ہیں ان کے ملنے والے دفتر میں بھی اپنے مسائل پر مشورہ طلب کرنے کے لیے آ جاتے ہیں اور وہ نہایت ہی مشفقانہ انداز میں ان لوگوں کی رہبری کرتے ہیں عموماً شام کے وقت ان کے چاہنے والے ان کے دیوان خانے پر آ جاتے ہیں وہ نہایت ہی خلوص سے ان لوگوں سے باتیں کرتے ہیں اور انھیں چائے بھی پلاتے ہیں ان سے باتیں کرتے ہوئے چند گھنٹے وقف ہو جاتے ہیں اس کے بعد رات کا کھانا کھانے کے بعد مطالعہ کرتے ہیں۔

لہجہ:

غضنفر کی آواز کھلی ہوئی ہے اور لہجہ بھی تیز ہوتا ہے لیکن اس لہجے میں ایک طرح کی اپنائیت ہوتی ہے دوستوں کی محفلوں میں رہنا انھیں اچھا لگتا ہے اور دوستوں سے مل کر خوش بھی ہوتے ہیں۔ ان کے دوستوں میں ہندو مسلم دونوں ہیں۔ یہ سبھی سے محبت کرتے ہیں ان کے مزاج میں نرمی اور سنجیدگی ہے وہ ایک سیدھے سادے شریف اور مخلص انسان ہیں۔ علی احمد فاطمی لکھتے ہیں:

> ''ان کے مزاج میں سادگی فطرت میں ایک کھلا پن ہے ان کی شخصیت پیچیدگی سے عاری ہے ان کے مزاج کا کھلا پن غالباً ان کے ماحول کی دین ہے۔ غضنفر پہاڑ پر گیارہ سال رہے پہاڑوں کی وسعت وہاں کے لوگوں کی سادگی ذہن و دل کی آزادانہ روش نے ان پر کافی اثر ڈالا یہ چیز میں ان کی تخلیقات میں بھی دکھی جا سکتی ہیں'' [۱۴]

تہذیبی روایت کی پاسداری:

غضنفر کی پیدائش جس ماحول میں ہوئی وہ بڑی حد تک قدیم تہذیبی روایات کا پاسدار تھا وہ بڑوں کا ادب و احترام کرتے اور چھوٹوں سے شفقت و محبت سے پیش آتے ہیں ان کی شخصیت حسن اخلاق

علم دوستی ادب نوازی، رواداری، دوستانہ ہمدردی، مہمان نوازی کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔

غضنفر اپنے عزیز و اقارب دوست و احباب اور اساتذہ کی ہر خوشی میں شامل ہوتے ہیں اور انھیں بھی اپنی خوشیوں میں شریک رکھتے ہیں وہ خود ان سے ملنے جاتے ہیں اور اپنے یہاں انھیں بلا لیتے ہیں چنانچہ علی احمد فاطمی ان کی شخصیت کی اس خوبی پر ایک واقعہ کے حوالے سے روشنی ڈالی ہے وہ لکھتے ہیں:

> ''ایک دن ڈاک میں ایک خاکی رنگ کا لفافہ ملا ممتاز صاحب کی آمد اور پروگرام کے انتظام میں ہم اس قدر مصروف تھے کہ لفافہ کھولنے تک کی نوبت نہ آئی بعد میں اطمینان سے کھولا تو غضنفر کی طرف سے سولن آنے کی سرکاری دعوت تھی تقریباً پندرہ بیس دن کے لیے مدعو کیا گیا تھا۔ ہماچل کے اسکولوں میں جا کر اردو درس وتدریس کا معائنہ کرنا تھا۔ غضنفر سے ملنے کی تڑپ سولن شملہ گھومنے کی خواہش نے ہمیں سولن پہنچا دیا'' [۱۵]

آگے علی احمد فاطمی نے ان کی مہمان نوازی اور شریف النفس کی ستائش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> ''جب ہم سولن پہنچے تو غضنفر و بشریٰ بھابھی نے جس طرح استقبال کیا اس نے فوری طور پر ہمیں ایک بار پھر حیرت میں ڈال دیا۔ اس وقت تک غضنفر ایک بیٹے کا بھی باپ بن چکا تھا میاں بیوی دو چھوٹے چھوٹے بیٹی بیٹے اور پہاڑ کی وادی میں بسا ہوا چھوٹا سا گھر لیکن بشریٰ بھابی کی نفاست اور سلیقہ مندی کا اعلان کرتے ہوئے پھر ہم نے دیکھا کہ وہاں گھر اور محلے ٹیڑھے میڑھے ہیں لیکن لوگ بڑے سیدھے ہیں۔ غضنفر کی سادگی اور شرافت ہماچل

کے گنگناتے آبشاروں ،منڈ راتے بادلوں اور بہتے ہوئے ٹھنڈے نیلے نیلے
پانی میں گھل مل گئی اور وہ اس فطرت کا حصہ ہونے لگا'' ۱۶

غضنفر کی شخصیت کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ جس ماحول میں جاتے ہیں اسی رنگ میں خود کو ڈھال لیتے ہیں۔

انتھک محنت ،سادگی وایمانداری:

کم عمری ہی میں غضنفر کو خوب شہرت حاصل ہوئی۔لیکن جب ان کی شخصیت کا مطالعہ کیا جائے تو یہی سنجیدگی اور سادگی ان کے مزاج کا بھی حصہ نظر آتی ہے وہ انتھک محنت کرتے ہیں اوور ایمانداری سے ادب کی خدمت میں مصروف رہتے ہیں۔ان کی شہرت ومقبولیت کے پیچھے ان کی شخصیت جو ہے اس کی ستائش کرتے ہوئے علی احمد فاطمی کہتے ہیں:

''غضنفر آج اردو فکشن کا بہت اہم اور شہرت یافتہ نام ہے لیکن یہ شہرت اس نے ادبی ریا کاری اور افسانوی کرتب بازی یا شاعرانہ مکر وفریب سے حاصل نہیں کی جیسا کہ ان دنوں عام ہے شہرت و سعادت اس نے واقعی اپنی ریاضت ،محنت، شخصیت کی سادگی اور ایمانداری اور فنکارانہ ذمہ داری کی ....فکشن کا فکری اور فطری راستہ اپنا کر حاصل کی'' ۱۷

غضنفر کی شخصیت کی یہ خوبیاں ہمیں ان کی تخلیقات میں بھی نظر آتی ہے ان کی کہانیوں کو پڑھنے کے بعد ان کی شخصیت واضح طور پر ان کے اسلوب میں نظر آتی ہے۔

غضنفر کی شخصیت کے بارے میں دوست واحباب کے تاثرات:

غضنفر ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں۔ایک انسان ،ایک استاد، ایک شاگرد، ایک دوست،

ایک ناول نگاراور ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے وہ ہمیشہ قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے رہے ہیں۔ وہ بہت محبت اور خلوص کے ساتھ پیش آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے چاہنے والوں کی تعداد بہت ہی زیادہ ہے ایک جگہ علی احمد فاطمی ان کی اسی صفت کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''غضنفر کی یہی ادا انھیں بحیثیت انسان اور بحیثیت فنکار زندہ رکھے گی کہ انھوں اپنی غزل گوئی کو غزل بازی میں نہیں بدلا اور اپنی افسانوی حقیقت کو غیر حقیقی افسانوی کی شکل میں نہیں پیش کیا۔ ان کے بعض ناول علامتی، تخیلی ضرور ہیں لیکن ان سب کا ماضی سے لے کر حال تک کی حقیقت سے گہرا تعلق ہے وہ لکچرر ہوئے ریڈر ہوئے، پرنسپل ہوئے، شاعر، افسانہ نگار، ناول نگار سبھی کچھ ہوئے لیکن افلاطون نہیں ہوئے ایک اچھے انسان اور اچھے دوست ہی رہے'' ۱۸؎

غضنفر کی یہی خاصیت ہے کہ آج بھی ان کے ذہن میں ایک عام انسان کے دکھ درد و مسائل کی دنیا بسی ہوئی ہے۔ جو کہ کہانی کا روپ لے کر ان کے افسانوں میں نظر آتی ہے۔ ان کی طبیعت میں سادگی ہے اور یہی سادگی انھیں شہرت و مقبولیت کے باوجود مصروف نہیں کیا اور وہ ایک عام انسان اور اچھے انسان کی طرح زندگی بسر کر رہے اور خاموشی سے ادب کی خدمت میں مصروف ہیں۔

بحیثیت شاگرد:

غضنفر اپنے اساتذہ کا بہت ہی احترام کرتے ہیں اور اپنی ہر کامیابی کے پیچھے اپنے اساتذہ کی رہنمائی اور دعا پر یقین رکھتے ہیں۔ ان کا شمار اپنے زمانے کے ذہین اور ہر دل عزیز طلبا میں ہوتا ہے۔ وہ اپنے بزرگوں کا بہت احترام کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہم عصر ساتھیوں کے علاوہ ان کے اساتذہ

بھی ان کی بے حد عزت کرتے ہیں۔غضنفر کی کامیابی کو دیکھتے ہوئے ان کے استاد شہر یار لکھتے ہیں:

''وہ میرے شاگرد ہیں مجھے خوشی ہے کہ وہ بھی مجھے استاد مانتے ہیں اور احترام کرتے ہیں۔کوئی ورکشاپ ان کی ہو کوئی کام اچھا برا ایسا نہیں ہے جس میں میں کسی نہ کسی شکل میں شریک نہ رہا ہوں۔ پھر ان کی کامیابی دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوتی ہے۔ میں ان کے معاملہ میں بہت Objective نہیں ہوسکتا۔ خاصاً Subjective رہتا ہوں۔انھیں بہت عزیز رکھتا ہوں اگر ان کی کمزوری کوئی بیان کرتا ہے تو مجھے اچھا نہیں لگتا'' 19

اس اقتباس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ غضنفر کے استاد انھیں کتنا عزیز رکھتے ہیں اور انھیں مثل اپنی اولاد کے تصور کرتے ہیں۔جس طرح وہ انے اولاد کے ہر معاملے میں Objective نہیں رہ سکتے ہیں اسی طرح کا رویہ غضنفر بھی اپنے شاگرد کے ساتھ اختیار کرتے ہیں۔

مذکورہ بالا مباحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ غضنفر ایک نیک دل، شریف النفس، مہذب اور مخلص و ہمدرد انسان ہیں۔ وہ نہ صرف اپنے دوست واحباب اور اساتذہ بلکہ شاگردوں میں بھی بحیثیت انسان کافی مقبول ہیں۔سادگی ، نفاست پسندی، شریف النفس، مخلص اور مہمان نوازی، شہرت ومقبولیت سے دوری اور محنت وایمانداری وغیرہ ایسی صفات ہیں جس کی بدولت غضنفر ایک بہترین انسان کی صورت میں سامنے آتے ہیں۔

*****

حواشی

١؎ غضنفر سرخ رو آفاق میں (خاکہ شہریار) مشمولہ سرخ رو/ص:31

٢؎ غضنفر سرخ رو آفاق میں (خاکہ شہریار) مشمولہ سرخ رو/2010،ص:31

٣؎ غضنفر کی مرقع نگاری/ ڈاکٹر ظفر کمال، مشمولہ سرخ رو/ص:13

٤؎ علی احمد فاطمی/ دیدہ و دل تمام آئینہ، مشمولہ، اردو فکشن کی ایک معتبر آواز/ص:33

٥؎ غضنفر، سرخ رو/ص:127

٦؎ غضنفر، سرخ رو/ص:130

٧؎ غضنفر، سرخ رو/ص:131

٨؎ غضنفر، سرخ رو/ص:132

٩؎ غضنفر، سرخ رو/ص:128

١٠؎ شہریار، غضنفر میری طاقت بھی ہیں اور کمزوری بھی، مشمولہ، اردو فکشن کی ایک معتبر آواز/ص:17

١١؎ صفدر امام قادری، غضنفر کا افسانوی بیانیہ، مشمولہ، اردو فکشن کی ایک معتبر آواز/ص:71

١٢؎ علی احمد فاطمی/ دیدہ و دل تمام آئینہ، مشمولہ، اردو فکشن کی ایک معتبر آواز/ص:24

١٥؎ غضنفر، سرخ رو/ص:131

١٦؎ علی احمد فاطمی/ دیدہ و دل تمام آئینہ، مشمولہ، اردو فکشن کی ایک معتبر آواز/ص:31

١٧؎ علی احمد فاطمی/ دیدہ و دل تمام آئینہ، مشمولہ، اردو فکشن کی ایک معتبر آواز/ص:28

١٨؎ علی احمد فاطمی/ دیدہ و دل تمام آئینہ، مشمولہ، اردو فکشن کی ایک معتبر آواز/ص:28

١٩؎ علی احمد فاطمی/ دیدہ و دل تمام آئینہ، مشمولہ، اردو فکشن کی ایک معتبر آواز/ص:34

باب دوم
غضنفر کے ہم عصر افسانہ نگاروں کے افسانوں میں خواتین کے مسائل

غضنفر کے ہم عصر افسانہ نگاروں کے افسانوں میں خواتین کے مسائل

انسان ابتدا سے ہی کہانیاں سننا پسند کرتا رہا ہے کیوں کہ اس میں دلچسپ واقعات وسانحات رونماں ہوا کرتے ہیں اور یہی کہانیاں رنگ بدل بدل کر مختلف اصناف میں نمودار ہوئیں۔ جس میں تخیل سے زیادہ حقیقت پر زور دیا جانے لگا۔ اردو ادب کی انہی اصناف میں سے ایک صنف کا نام افسانہ ہے۔ افسانہ دراصل وہ صنف ہے جس میں زندگی کی حقیقتوں کو بڑے ہی اختصار کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔

اردو افسانہ روز اول سے ہی حقیقت کا ترجمان رہا ہے۔ اس نے ہمارے معاشرے کے تقریباً سبھی پہلوؤں کی عکاسی کی ہے یوں تو ادب کی جملہ اصناف میں شعوری ولاشعوری طور پر سماج اور معاشرے کی عکاسی ہوتی ہے۔ لیکن افسانہ ایک ایسی صنف ہے جس کا تعلق براہ راست انسانی معاشرے سے ہے۔ ان کے کردار کسی نہ کسی طبقے یا جماعت سے تعلق رکھتے ہیں۔ معاشرے کی بنیاد خواتین سے قائم ہے۔ خواتین ہی معاشرے کا اہم حصہ ہیں۔ تہذیب واصلاح میں بھی ان کا اہم رول رہا ہے۔ اردو افسانہ نگاروں نے عورتوں کے متعدد مسائل کو موضوع بنایا ہے اور سماج کی اصلاح کی ترقی میں قابل ذکر حصہ داری ادا کی ہے۔

اگر اردو افسانہ نگاروں کی بات کی جائے تو یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ اردو کے پہلے افسانہ نگار پریم چند ہیں جنھوں نے دیہی زندگی کے مسائل کے ساتھ ساتھ خواتین کے مسائل کو بھی اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا ہے۔ ان کے بعد بہت سے افسانہ نگاروں نے خواتین کے موضوعات کو افسانے کا حصہ بنایا ہے۔ بیسویں صدی کے جن افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں میں خواتین کے مسائل کو اُجاگر کیا ہے ان میں چند نام بہت ہی مشہور ہیں:

بیگ احساس:

بیگ احساس 1980ء کے بعد ابھرنے والے افسانہ نگاروں میں سے ایک نامور افسانہ نگار ہیں۔انھوں نے اپنی غیر معمولی قابلیت اور فنی صلاحیتوں کے بدولت ایسے افسانے تحریر کیے ہیں جو پڑھنے والوں پر گہرے تاثرات مرتب کرتے ہیں۔اس کے علاوہ وہ اپنے موضوع اور لب لہجہ کی وجہ سے منفرد نظر آتے ہیں۔ ان کے اب تک تین افسانوی مجموعے ''خوشہ گندم''1979ء، ''حنظل''1993ء، ''دخمہ''2018ء شائع ہوکر منظر عام پر آئے ہیں۔نورالحسنین اپنے ایک مضمون میں بیگ احساس کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''بیسویں صدی کی آٹھویں دہائی میں ابھرنے والے افسانہ نگاروں میں بیگ احساس ایک ایسے افسانہ نگار ہیں جو نہ تو ہر موضوع کے پیچھے دوڑے اور ناہی بسیار نویسی کا مظاہرہ کیا بلکہ وہ نہایت آہستہ روی سے قدم اٹھاتے رہے جب تک انھیں ان کے مزاج کا موضوع نہیں مل جاتا وہ کاغذات سیاہ نہیں کرتے اسی وجہ سے وہ آج تک تازہ دم ہیں۔افسانے میں کہانی اور کردار کو واپس لانے میں ان کا بھی اتنا ہی حصہ ہے جن کا دعویٰ ان کے ہم عصر کرتے ہیں''[1]

بیگ احساس ایک حساس اور منفرد شخصیت کے مالک ہیں۔انھوں نے اپنے تجربے، مشاہدے اور غور وفکر کی بنا پر کئی مسائل چاہے وہ سماج میں ہو یا گھر کی چہار دیواری سے اُبھرنے والے ہوں اس کو افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔اس کے علاوہ مرد اور عورت کی بنتی بگڑتی کیفیت اور ان کے درمیان نفسیاتی کشمکش کو جس طرح سے پیش کیا ہے وہ قابل مطالعہ ہے۔ان کا ایک افسانہ ''نجات'' ہے جو اسی موضوع پر

ہے۔جس میں عاشی مرکزی کردار ہے۔عاشی کا شوہر ذہنی تناؤ کی وجہ سے اپنی بیوی سے دور رہتا ہے۔ جوآج کل ہمارے سماج میں یہ عام ہوگیا ہے کہ ہرکوئی اپنی بیوی کو چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔عورت کے درد وغم کوکوئی نہیں سمجھتا ہے۔وہ اندر ہی اندر تڑپتی ہے روتی ہے کوئی اس کا سننے والانہیں ہوتا ہے۔ایک دن جب دیوانگی ختم ہوجاتی ہےتو وہ احساس شرمندگی کی باعث دور ہوجاتا ہے۔

اس افسانے کے ذریعہ بیگ احساس یہ کہنا چاہتے ہیں کہ عورت ممتا کی مورت ہوتی ہے۔وہ ہر درد برداشت کرتی ہے۔ ہر دکھ جھیلتی ہے جب شوہر چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ ہزاروں مصیبتوں کا سامنا کرتی ہے پھر جب وہ واپس آتا ہے اسے معاف کردیتی ہے۔اس طرح بیگ احساس نے عورت کے جذبات کو بڑی ہی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔

نورالحسنین:

نورالحسنین موجودہ دور کے ابھرنے والے افسانہ نگاروں میں سے ایک جانی پہچانی شخصیت ہیں۔انھوں نے اپنے افسانوں میں ایسی تحریریں پیش کی ہیں جو ہر عام وخاص میں مقبول ہوئے۔ان کے اب تک تین افسانوی مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ پہلا افسانوی مجموعہ ’’سمٹتے دائرے‘‘1988ء، دوسرا افسانوی مجموعہ ’’مور رقص اور تماشائی‘‘1988ء اور تیسرا افسانوی مجموعہ ’’گڑھی میں اترتی شام‘‘1999ءمیں شائع ہوکر منظر عام پر آچکے ہیں۔

نورالحسنین کے افسانوں کے موضوعات بالکل عام لوگوں کی زندگی اوران سے جڑے مسائل پر مبنی ہیں۔ان کے افسانوں میں زندگی کی کشمکش اس کے اتار چڑھاؤ اور مسائل ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ جہاں امیر طبقہ کس طرح غریب طبقے کے لوگوں کو استعمال کرتے ہیں۔ان کی آڑ میں غریبوں کا کس طرح خون چوستا ہے۔کس طرح آج کے سماج میں ایک غریب گھرانے کی لڑکی کو مصیبت کا سامنا کرنا پڑتا ہے

بیان کیا ہے۔ان کا افسانہ ''دوسرے کنارے تک'' اس بات کا تجزیہ پیش کرتا ہے جس میں انھوں نے امیری اورغریبی کوموضوع بنا کرقلم بند کیا ہے۔

اس افسانے کا مرکزی کردار صبا ہے جومتوسط طبقہ سے تعلق رکھتی ہے۔وہ بے حد حسین اورذہین تھی وہ پڑھ لکھ کر افسر بننا چاہتی تھی۔اس کے والد چپراسی کی ملازمت انجام دیتے تھے جو اتنی کم تنخواہ کے باوجود بھی صبا کو تعلیم سے آراستہ کراتے تھے۔لیکن کالج میں پڑھنے والے امیرلڑکے کی جھوٹی محبت کے جال میں پھنس جاتی ہے۔اس طرح وہ اپنا کریر برباد کرلیتی ہے بلکہ اپنی زندگی میں زہر گھول لیتی ہے۔ جب یہ بات لڑکے کے والد کو پتہ چلتی ہے تو وہ اپنے عہدہ کا ناجائز فائدہ اٹھا کر کالج سے بے دخل کردیتا ہے۔جب یہی بات اس کی بیٹی کے ساتھ ہونے لگتی ہے۔تو وہ تلملا اٹھتا ہے اور اپنی بیٹی کو زمانے کا شکار ہونے نہیں دیتا۔افسانے کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''نہیں نہیں! اس کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی۔آپ فوراً آجایئے یہاں سلمیٰ کو کالج میں کوئی لڑکا بے حد تنگ کررہا ہے۔وہ اکثر اس کی بائک کی ہوا نکال دیتا ہے میرا جی چاہتا ہے کہ سلمیٰ کالج سے بٹھالوں۔نہیں نہیں بالکل نہیں! میں نے پوری سختی کے ساتھ کہا لیکن ٹھیک اسی وقت میرے دماغ پر کسی نے ضرب لگائی ہر جرم کی سزا ضرور ملتی ہے تو کیا سزا کا وقت آ گیا ہے میں بری طرح گھبرا گیا لیکن فوراً اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے بولا۔ہیلو سلمیٰ کالج ضرور جائے گی میں تاریخ کو دوبارہ ہی کھیل کھیلنے نہیں دوں گا میں جلدی واپس آرہا ہوں'' ؎۲
>
> (اردو افسانہ کا تنقیدی جائزہ 1980ء کے بعد/ص:148)

اس سے پتہ چلتا ہے کہ نورالحسنین نے اس افسانے میں ایک لڑکی کے جذبات اور درد کو بیان کیا ہے۔ ہرلڑکی جو کالج میں پڑھتی ہے اسے اس درد سے گزرنا پڑتا ہے۔نورالحسنین کے کمال فن کی خوبی یہ ہے کہ انسانی زندگی کے رشتوں کا پس منظر بھی فطری انداز میں بیان کرتے ہیں۔ وہ مشکل زبان کا استعمال نہیں کرتے بلکہ سیدھی سادی زبان میں افسانہ لکھتے ہیں جو نہ صرف فکر انگیز ہوتا ہے بلکہ انسانوں کے دماغ پر گہرا تاثر چھوڑتا ہے جس سے پڑھنے والا لطف اندوز ہوتا ہے۔

نگار عظیم:

نگار عظیم کا اصلی نام ہجر نگار ہے اور قلمی نام نگار عظیم ہے۔23 ستمبر 1951ء کو میرٹھ میں پیدا ہوئیں۔آبائی وطن مرادآباد ہے۔نگار عظیم ایک ایسی معتبر آواز ہے جنھوں نے اپنی تحریروں سے سماج اور انسانی سیرت میں پنپتے ناسوروں کی نشاندہی کی ہے۔ وہ دراصل اس بات پر زور دیتی نظر آتی ہیں کہ عورت مردانہ ظلم وستم اور زیادتیوں کو برداشت نہ کرے۔ چونکہ جب وہ مردوں کے ظلم وستم برداشت کرتی ہیں یا نظر انداز کرتی ہیں تو اس پر اور زیادہ ظلم، ناانصافی اور محکومیت کے تالے جڑ دیئے جاتے ہیں۔نگار عظیم نے پہلا افسانہ 1974ء میں لکھا جو ماہنامہ ''شان ہند'' دہلی میں شائع ہوا۔ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''عکس'' کے نام سے 1990ء میں اشاعت پذیر ہوا۔دوسرا مجموعہ ''گہن'' 1999 میں چھپا۔

جہاں تک نگار عظیم کے افسانوں میں خواتین کے مسائل یا جذبات واحساسات اور لب ولہجہ کا تعلق ہے تو یہ کہنا بے جانہ ہوگا کہ ان کے افسانوں میں مرکزی حیثیت اور اہمیت عورت کو ہی حاصل ہے۔ انھوں نے زندگی کو جیسا پایا ویسا ہی اپنی کہانیوں میں پیش کیا۔ عام انسان کی زندگی ان کی وارداتیں اور مسائل سے وہ ایک خاص قسم کا تعلق رکھتی ہیں اور اُن وارداتوں کو وہ اپنے افسانوں میں سموتی ہیں۔ وہ ایک عورت ہونے کے ناطے سماج میں عورت کے مقام ومرتبے اور ان کے مسائل کو دور کرنے کے لیے نہ

صرف مقام ومرتبہ اوران کے مسائل کو دور کرنے کے لیے نہ صرف فکر مند ہیں بلکہ دور کرنے کی کوشش بھی کرتی ہیں۔ وہ اپنے افسانوں میں مردوں کے کیے ہوئے اس سماج میں عورت پر ظلم وستم کو بیان کرتی ہیں اور انھیں اس سے دور ہونے کی بات کو پیش کرتی ہیں۔ پروفیسر قمر رئیس نے نگار عظیم کے بارے میں متوازن رائے قائم کی ہے وہ لکھتے ہیں:

''نگار نے آج کی نئی پیڑھی کی لڑکی کی سرکشی، بے باکی، خود آگہی اور خود اعتمادی کی تصویریں بھی بڑی جرأت سے دکھائی ہیں۔ ''بیاہ'' میں وہ بتاتی ہیں کہ سماج کی کونسی قوتیں ہرنی کو طوائف بننے پر مجبور کرتی ہیں لیکن ''ریڈ لائٹ'' اور ''روشنی'' میں وہ عورت کو مرد کے جبر وتحکم سے نجات کی نئی راہیں دکھاتی ہیں۔ روشنی کی سنیتا کو جب جہیز کے لالچ بر ملتے ہیں تو وہ مایوس ہو جاتی ہیں۔ مایوسی کے اندھیروں میں خدمت خلق کا جذبہ روشنی کی ایک کرن کی طرح نمودار ہوتا ہے اور اسے بڑی تسلی دیتا ہے۔'' ۳۲

اس سے معلوم یہ ہوا کہ نگار عظیم ایک ایسی ذہنیت کی حامل خاتون ہیں جو اپنے ہر افسانے میں عورت کی نفسیات اس کی بےبسی کے کئی پہلوؤں کو مردانہ ظلم وستم کے حوالے سے پیش کرتی ہیں۔ عورت کی لاچاری اور بےبسی کا صدمہ ہمیشہ نگار عظیم کی آنکھوں اور دل میں موجود رہا ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ عورت مردوں کے ظلم وستم برداشت نہ کرے بلکہ ایک طرح کا جذبہ پیدا کریں۔

ڈاکٹر احمد صغیر:

احمد صغیر ایک بہترین فکشن نگار ہیں۔ ان کی تحریریں ان کی شعوری فکر اور جستجو کا حسین مرقع پیش کرتی ہے۔ ان کے پانچ افسانوی مجموعے ہیں۔ پہلا افسانوی مجموعہ ''منڈیر پر بیٹھا پرندہ'' 1995ء،

دوسرا ''انّا کو آنے دو'' 2001ء، تیسرا ''درمیان کوئی تو ہے'' 2007ء، چوتھا ''داغ داغ زندگی'' 2013ء میں پانچواں ''کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی'' 2015ء میں شائع ہو کر منظر عام پر آ چکے ہیں۔

احمد صغیر ایک حساس مند شخصیت کے مالک ہیں۔ لوگوں کے لیے ان کے دل میں ہمدردی اور فکرمندی کا جذبہ بیدار ہے۔ ان کے کئی افسانے ایسے ہیں جو ان کی فکری آگہی اور فنی ادراک کا بہترین نمونہ پیش کرتی ہے۔ جن میں سماجی، سیاسی اور معاشرتی بصیرتوں کو بڑی خوبصورتی سے اُجاگر کیا ہے۔ احمد صغیر کے افسانوں پر پروفیسر فیروز عابد رقم طراز ہیں:

> ''احمد صغیر پس ماندہ طبقے، اقلیت، غربت، ضرورت منداور سیکولر لوگوں کے دوست ہیں۔ وہ ایک صحت مند انقلاب کے علم بردار بھی ہیں وہ اپنی کہانیوں کے ذریعہ ''آج'' کو بیان کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ آج جو بہت کڑوا ہے مگر افسانہ نگار کہیں بھی مستقبل سے مایوس نہیں'' ؎

ان کا ایک افسانہ ''تعفن'' ہے جو ان کے افسانوی مجموعہ ''درمیان کوئی تو ہے'' میں شامل ہے جن میں انھوں نے ایک عورت کی اندرونی خواہشات کو بیان کیا ہے۔ ''تعفن'' ایک ایسی کہانی ہے جس میں احمد صغیر نے غریبی اور افلاسی کو موضوع بنا کر پیش کیا ہے۔ اس افسانے کا مرکزی کردار کم سن بچہ منوا ہے۔ جو اپنے افلاس کی بدولت کچرے اور کوڑے کرکٹ سے استعمال شدہ چیزیں چن کر کباڑوں تک پہنچاتا ہے اور جو پیسے ملتے ہیں ان پیسوں سے اپنا اور اپنی ماں کا پیٹ بھرا کرتا تھا۔ منوا چونکہ کوڑے کرکٹ کا کام انجام دیتا ہے۔ جس کی وجہ سے وہ مسلسل بدبوا اور گندگی کے ماحول میں رہنے لگتا ہے۔ جس سے لطافت اور خوشبو کا احساس اس کی زندگی سے غائب ہو جاتا ہے۔ اسی افسانے کا دوسرا کردار مسز ملکانی ہے

۔ یہ ایک دولت مند خاتون ہے لیکن اس کے نصیب میں کوئی اولاد نہیں ہے۔ جس کی وجہ سے منوا کو دیکھ کر اس کے دلی جذبات میں ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے۔ افسانہ کا اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''مسنر ملکانی روز منوا کو سامان لیتے دیکھتی اسے بہت افسوس ہوتا کہ غربت نے اس بچے کو کہاں لاکر پھینکا ہے اس کی عمر ابھی پڑھنے لکھنے کی تھی لیکن قسمت نے ہاتھوں میں بورا پکڑا دیا ہے۔ منوا پر مسنر ملکانی کو بہت ترس آتا۔ ملکانی کی شادی کو کئی سال ہو گئے تھے مگر ابھی تک اس کی گود خالی تھی شاید اس لیے بھی اس کی نگاہیں منوا کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتی رہتی'' ۵

اس سے پتہ چلتا ہے کہ عورت کتنی مجبور ہوتی ہے جب کوئی عورت بے اولاد ہوتی ہے اسے دوسرے کے بچے بھی پیارے لگتے ہیں۔ یہاں پر ایک عورت کی مجبوری دیکھنے کو ملتی ہے۔ بے اولاد ہونا عورت کے لیے سب سے بڑا مسائل ہوتا ہے۔ مسنر ملکانی کا منوا کو حسرت بھری نگاہ سے دیکھنا اور اسے پیار سے کھانا کھلانا ایک عورت کی اندرونی جذبات کی دلی کیفیات ہے۔ وہ دولت سے بڑی تو ہوتی ہے مگر ممتا سے اس کی زندگی خالی ہے۔ اسی ممتا بھرے دل سے ایک دن مسنر ملکانی لذیز کھانا بنا کر کھلاتی ہے تو منوا اس کی لذت اور خوشبو کی تاب نہ لاکر بے ہوش ہو جاتا ہے۔ احمد صغیر اس افسانے میں ایک عورت کی اندرونی دلی جذبات کو بیان کیا ہے۔ ان کے افسانوں میں خواتین کے مسائل کے متعلق درد ہوتا ہے۔ جس کو پڑھنے والا پوری طرح محسوس کرتا ہے۔

ترنم ریاض:

ترنم ریاض موجودہ عہد کی شہرت پانے والی افسانہ نگاروں میں سے ایک اہم افسانہ نگار ہیں۔ انھوں نے اپنے ذوق وشوق اور ذہنی فکر کے باعث کئی افسانے قلم بند کیے جو قارئین اور ناقدین کے

درمیان خوب مقبول ہوئے۔اوراپنی ادبی خدمت کے ذریعہ اردو دنیا کے دامن کو وسیع وعریض کرنے میں مدد ومعاون ثابت ہوئے۔ان کے اب تک چار افسانوی مجموعے''تنگ زمین'' 1998ء،''ابابلیں لوٹ آئیں گی'' 2000ء،''بیمرزل'' 2008ءاور''مرارخت'' 2008ء میں شائع ہوکر منظر عام پر آئیں ہیں۔

ترنم ریاض ایک حساس اور باشعور فکشن نگار ہیں ان کے افسانے زندگی کے اردگرد گھومتے ہوئے نظر آتے ہیں۔جن میں انسانی اور جذباتی رشتوں کو کافی اہمیت دی گئی ہے۔اس کے علاوہ عورتوں کے مسائل کو بہت ہی سنجیدگی سے پیش کرتی ہیں۔میاں بیوی کی وقت وقت میں بدلتی ہوئی کیفیت کو اپنے افسانے کا موضوع بناتی ہے۔اسی طرح کا ان کا ایک افسانہ''گونگی'' ہے۔جوان کے افسانوی مجموعہ''یہ تنگ زمین'' میں شامل ایک ایسا افسانہ ہے جوخواتین کے نقطہ نظر سے ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے۔

اس افسانے میں ایک مرکزی کرداراورایک ضمنی کردار کے ذریعہ عورت کے مسائل کو پیش کیا گیا ہے۔افسانہ گونگی کا مرکزی کردار ایک ایسی لڑکی ہے جومعصومیت اورسادگی میں لپٹی ہوئی ہے۔جو ہر وقت کانپتی ہے لیکن بولتی بہت کم ہے اوراسی کم گوئی کی وجہ سے اسے ہرکوئی گونگی کے نام سے پکارتے ہیں۔گونگی اپنے ماں باپ کی ایک اکلوتی بیٹی ہے اور دو بھائیوں کی لاڈلی بہن ہے۔اس کا خاندان شرافت،عزت کے لحاظ سے شہرت رکھتا تھا۔گونگی کا رشتہ چھوٹے صاحب کے ساتھ طے ہوتا ہے۔پرگونگی نہ ہی بہت زیادہ خوبصورت تھی اور نہ ہی زیادہ بدصورت۔اس کا جسم اورقد درمیانہ،چھوٹی چھوٹی آنکھیں اور بال ضرورت سے زیادہ گھنے تھے۔چھوٹے صاحب نے جب پہلی مرتبہ اسے دیکھا تو اسے گونگی راس نہ آئی اور خود کو ذہنی طور پر اسے قبول کرنے کی کوشش میں جٹ گئے۔دوسری طرف گونگی جیسے بچپن سے ہی اتنی محبت ملی تھی کہ اسے محرومی کا بھی احساس ہی نہیں ہوا تھا۔اس کی زندگی پرسکون اور آسودہ تھی۔اس سر

شاری نے اس میں ہر شئے کے لیے محبت بھر دی تھی۔

گونگی کے گھر میں دو جیٹھانیاں تھیں جو ہر وقت اس سے چڑتی تھیں۔اس لیے نہ گونگی نے اپنی امارت سے زیادہ شرافت کی وجہ سے دوسروں کو اپنی طرف مرغوب کیا۔گونگی جسے کردار کے ذریعہ ایک ایسی عورت سامنے آتی ہے جو ہر مصیبت کا سامنا کرتی ہے وہ ہر حال میں اپنے گھر کو سنبھالنے کی کوشش میں جٹی ہوئی ہے۔وہ کسی بھی مصیبت میں اپنے گھر میں ایک ایک فرد کا دل جیتنے کی کوشش کرتی ہے۔

ایک وقت ایسا بھی آتا ہے۔جب گونگی کے شوہر یعنی چھوٹے میاں کا دل گھر میں کچھ من نہیں لگتا ہے پہلے سال وہ گھر سے تھوڑا تھوڑا باہر رہتا ہے اور پھر کبھی رات بھر گھر سے باہر رہتا ہے۔

اس کے بعد اس کا شوہر دوسری شادی کر لیتا ہے اور نئی دلہن کو گھر لانے کے لیے کہتا ہے تو وہ نہ صرف رضامند ہو جاتی ہے بلکہ اپنے ہاتھوں سے اس کے لیے کمرہ بھی سجاتی ہے۔اس کی دریا دلی دیکھ کر اس کے شوہر کو اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے اور شرمندگی اور ندامت کے باعث دلہن کو گھر نہیں لاتا۔اس کے باوجود گونگی کو مختلف مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔اور اس کے اندرونی جذبات وخواہشات کو اس کا شوہر سمجھ نہیں پاتا ہے کس طرح وہ برداشت کرتی ہے۔افسانے کا ایک اقتباس ملاحظہ ہوں:

> ''در اصل ہم نے نکاح کر لیا تھا'' وہ چہرے کو چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے ماتھے کا پسینہ پوچھ کر بولے۔''اچھا'' وہ ایسے بولیں جیسے انھوں نے کہا ہو کہ باہر بارش ہو رہی ہے یا یہ کہ آج گھر میں مہمان آنے والے ہیں۔''وہ اب گھر آنا چاہتی ہے کہ اب اگر نہ لے کر گئے تو خلع لے لے گی اور اپنے خالہ زاد بھائی سے نکاح کر لے گی'' وہ اس کے نارمل تاثرات سے شہ پا کر ایک دم بولے۔''تم کیا کہتی ہو پھر؟''

وہ آہستگی سے بولی ''آپ جیسا مناسب جانیں'' ۶

اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ گونگی ہر درد کو برداشت کرتی ہے اور اس کا درد حد سے زیادہ بڑھ جاتا ہے جب کوئی شوہر کا عورت یہ کہتا ہے کہ میں نے دوسری شادی کر لی ہے تو اس پہ جو گزرتی ہے صرف وہی جان سکتی ہے۔ گونگی کا درد بھی اس کی زبان بند کر دیتا ہے وہ کچھ بول نہیں پاتی ہے۔ کیوں کہ ہر ایک چیز اس سے دور ہو جاتی ہے جب اس کا شوہر کہتا ہے کہ میں نے دوسری شادی کر لی ہے۔

لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ ترنم ریاض ایک ایسی افسانہ نگار ہیں جن کی تحریریں پڑھنے والے کو متاثر کرتی ہے۔ کیوں کہ ان کے افسانے حقیقت سے قریب ہوتے ہیں۔ جو زندگی کے میں درد و کرب سے لبریز ہوتے ہیں۔ جس میں عورت کے جذبات و خواہشات کی ترجمانی ہوتی ہیں۔

صادقہ نواب سحر:

صادقہ نواب سحر 18 اپریل 1957ء کو آندھرا پردیش میں پیدا ہوئیں۔ صادقہ نواب سحر موجودہ عہد کی مشہور و مقبول افسانہ نگاروں میں اہمیت کی حامل افسانہ نگار ہیں۔ جنھوں نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کی بنا پر کئی افسانے تحریر کیے ہیں جو ہر عام و خاص دونوں میں کافی شہرت حاصل کر چکے۔ ان کے اب تک دو افسانوی مجموعے ''خلش بے نام سی'' 2013ء، ''پیج ندی کا مچھیرا'' 2018ء میں شائع ہو کر منظر عام پر آ چکے ہیں۔

صادقہ نواب سحر اپنے افسانوں کے لیے کردار اپنے ماحول ہی سے اٹھاتی ہیں اور ان کے کردار میں جو کہانی بنتی ہے وہ بھی حقیقی زندگی سے اتنی قریب ہوتی ہے کہ افسانہ پر حقیقت کا گمان ہونے لگتا ہے۔ ان کے افسانوں کا محور وہ عصری انسان ہے جو ذہنی انتشار کا شکار ہے جس کا اثر اس کی زندگی کی نفسیاتی الجھنوں میں دکھائی دیتا ہے۔

ان کے افسانوں میں ایک اہم موضوع خواتین کے متعلق مسائل بھی نمایاں نظر آتے ہیں۔ دراصل انھیں موضوعاتی اور احساسات پر مبنی افسانے لکھنے میں خاص مہارت حاصل ہے۔ ان کے افسانوں میں تجربات، مشاہدات، حادثات اور واقعات کا بیان بالکل سیدھے سادے انداز میں نظر آتا ہےاور کہانی اپنے کرداروں کی زندگی کے اطراف گھومتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ان کے کردار دراصل حقیقی دنیا سے تعلق رکھتے ہیں۔ان کے کرداروں کا تعلق انسان اور انسانیت سے ہے جن میں زندگی اور اس سے وابستہ احساسات ہیں۔جنھیں ہم کسی جگہ یا مقام کی حد تک قید نہیں کر سکتے بلکہ افسانہ نگار روز بہ روز ہونے والے واقعات اور حادثات کا ذکر رشتوں کا بکھراؤ خود غرضی، معصوم لڑکیوں کا استحصال، سماج کی بے حسی، رشتوں کی پامالی جیسے مسائل کو بار بار اپنے افسانوں میں پیش کرتی نظر آتی ہیں۔

صادقہ نواب سحر نے انسانی رشتوں کی بے قدری زندگی کا تناؤ، الجھنوں اور بے چینیوں، غربت میں جیتے افراد ان کے افسانوں کے موضوع ہوتے ہیں۔ ان کا افسانہ ''ابارشن'' عورت کی اندرونی جذبات اور مرد کی خود غرضی کو پیش کرتا ہے۔اس میں ایک عورت پر اندرونی ظلم وستم ہوتے ہیں۔ جس کا بیان وہ کسی سے نہیں کہہ سکتی ہے وہ ماں بننے والی ہوتی ہے پھر بھی اس کا شوہر اپنی انسانیت بھول کے اسے کالج لے کر جاتا ہے۔

اس افسانے کا مرکزی کردار سربتا ہے۔اس کا شوہر امتحان دینے کے لیے اس لیے مجبور کرتا ہے تا کہ اس کے دفتر میں ملازمت مل جائے جبکہ وہ ناساز حالات میں ہوتی ہے۔ کالج کا پروفیسر کہتا ہے کہ صحت سے بڑھ کر کچھ نہیں ہوتا ہے۔ امتحان اگلے سال ہوجائے گا یہ سننے کے بعد اس کا شوہر اس کو سیڑھیوں سے گھسیٹے ہوئے یہ کہہ کر لے جاتا ہے کہ چل اب تیرا ابارشن کرواتا ہوں۔ افسانے کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

''میڈم! میں صرف اس کو امتحان دینے کو سمجھتا ہوں' وہ نرم پڑا پھر ذرا اٹھم کر بولا، ''وہ ڈرتی ہے.....کچھ نہیں ہوتا ہے ......اس کو بس......بس الٹی چکر......''

''خوش خبری ہے؟''

''ہاں-وہی تو......ابھی دو مہینے ہی ہوئے ہیں شادی کو'

''اگلی بار دے دے گی امتحان''پروفیسر مسکرا کر بولیں۔

''سال بے کار جائے گا نا!''

''جانے دونا!''

''نہیں ایسا نہیں ہے۔اس کو پہلے ہی سے شوق تھا پڑھائی کا ......مگر ابھی نا بولتی ہے پڑھنے کو'

''اگلے برس پڑھ لے گی نا!''پروفیسر بولیں

''یہ امتحان میں پاس ہوجائے گی تو میرا سیٹھ اس کو نوکری پر رکھ لے گا نا! ہمارے یہاں اس وقت ویکینسی ہے'' ؎

اس اقتباس سے پتہ چلتا ہے کہ صادقہ نواب سحر کی فن کمال کی خوبی یہ ہے کہ ایک سنجیدہ واقعہ کو بڑے ہی فطری انداز میں بیان کیا ہے۔ایک عورت جب ماں بننے والی ہوتی ہے تو اس وقت وہ بہت خوش ہوتی ہے۔مگر اس افسانے میں اس کا شوہر اسے ابارشن کروانے کے لیے زبردستی کر کے لے جاتا ہے کیوں کہ وہ یہی چاہتا ہے کہ وہ بھی نوکری کرے۔ یہاں پر ایک عورت کی مجبوری اور بے بسی کو صادقہ نواب سحر نے دکھانے کی کوشش کی ہے۔آج کے سماج میں اس طرح کے ظلم عام ہو چکے ہیں۔اس میں

ایک عورت کے اہم مسئلے کو دکھانے کی کوشش کی ہے جو روزمرہ کی زندگی میں آئے دن پیش آتے رہتے ہیں۔

اسلم جمشید پوری:

اسلم جمشید پوری موجودہ عہد کے ابھرنے والے افسانہ نگاروں میں سے ایک بہترین افسانہ نگار ہیں۔انھوں نے اپنے ذوق وشوق اور ذہنی فکر کے باعث ایسے افسانے قلم بند کیے جن کو نہ صرف قارئین نے بلکہ ناقدین نے بھی سراہا ہے۔ان کے اب تک دو افسانوی مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔جن میں ہر طرح کے مسائل کو افسانے کا موضوع بنایا گیا ہے۔

اسلم جمشید پوری ایک حساس اور باشعور فکشن نگار ہیں۔لوگوں کے لیے اپنے دل میں ہمدردی کا جذبہ رکھتے ہیں۔جس کی وجہ سے ان کے بیشتر افسانے گرد وپیش کے حالات پر مبنی ہے۔وہ ایسے تجربے اور مشاہدے کی بنا پر جو کچھ دیکھتے ہیں سمجھتے ہیں اس کو افسانے کا موضوع بناتے ہیں۔ان کے افسانوں میں نہ صرف روزمرہ میں پیش آنے والے واقعات ملتے ہیں بلکہ انسانی مجبوری بے بسی اور زمانے کے ستائے ہوئے لوگ ملتے ہیں۔انھوں نے اپنے نقطۂ نظر اور انداز بیاں اور سادہ لوحی کے ذریعہ ایسے واقعات بیان کیے جو انسان کے ظاہر کو نہیں بلکہ باطن کو بھی عیاں کرنے لگتے ہیں۔

ان کے افسانوں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ایسے چھوٹے چھوٹے واقعات کو اپنے افسانوں میں تحریر کرتے جو بڑے واقعات کا سبب بنتے ہیں۔ایسا ہی ان کا افسانہ ''افق پر مسکراہٹ'' ہے۔جس میں انھوں نے انسان کی کم عملی کی وجہ سے ہونے والی مصیبتوں کو بیان کیا ہے۔جب اولاد کوئی غلطی کرتی ہے تو ماں کو اس کا ہرجانا بھرنا پڑتا ہے۔ایک عورت تو باہر سے مضبوط دکھائی دیتی ہے۔مگر اندر سے وہ ٹوٹی ہوتی ہے۔جب اس کے گھر پر کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ رونے لگتی ہے جو ایک عورت کے اندرونی جذبات واحساسات ہے۔

افسانے کا مرکزی کردار جاوید ہے۔ جاوید ملازمت کے سلسلے میں اپنے والد کے ساتھ گھر سے دور رہتا ہے۔ ایک دن والد کی طبیعت خراب ہوجاتی ہے جس کی وجہ سے وہ ایک لال روشنائی سے لکھتا ہے۔ جاوید کے گھر والے یہ سمجھتے ہیں کہ اس کے والد کا انتقال ہوگیا ہے کیوں کہ ایک ایسا زمانہ ہوا کرتا تھا کہ جہاں موت کی خبر کو لال روشنائی سے لکھا جاتا تھا۔ اس خط سے ماں کے دل پر کیا گزرتی ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو۔

''آج ہی آیا ہے۔ بو بو جی کا انتقال ہوگیا نا!''

''ایں! کیا کہا؟ میں انھیں کل ٹھیک ٹھاک چھوڑ کر آیا ہوں' جاوید کے اس

جملے پر سب کے کان کھڑے ہوگئے۔ بابا نے اسے پکڑ لیا۔

''تو ٹھیک کہہ رہا ہے نا۔ میرا بیٹا زندہ ہے؟''

''میرا لعل زندہ ہے؟''

بوڑھی ماں کی آنکھیں چمک اٹھی تھیں۔

''جاوید ترے بابو جی زندہ ہیں نا؟''

ماں کی آواز حلق کے اندر سے آئی۔'' ۸؎

اس سے پتہ چلتا ہے کہ عورت کے اندر ممتا کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے۔ ہر ماں چاہتی ہے کہ اس کی اولاد ہمیشہ خوش رہیں زندہ رہیں۔ جب جاوید کے منہ سے اس کی دادی سنتی ہیں کہ اس کا بیٹا زندہ ہے تو بہت خوش ہوتی ہیں۔ بوڑھی ماں کی آنکھوں میں چمک کی لہر دوڑ جاتی ہے اور پھر جب جاوید کی ماں جانتی ہے تو اس کا شوہر زندہ ہے تو اس کے منہ سے آواز نہیں نکل پاتی ہے۔ ہر وہ عورت اپنے شوہر کے لیے ہمیشہ یہی دعا کرتی ہے کہ وہ سلامت رہے۔ اس افسانے میں بھی یہی بتایا گیا ہے۔

اسلم جمشید پوری کی خوبی یہ ہے کہ اپنے افسانے کی زبان کا انتخاب موضوع اور مواد کے مطابق کرتے ہیں۔اس کے علاوہ وہ مقامی زبان اور بولی کا بھی خاص خیال رکھتے ہیں۔ وہ اپنے افسانوں میں دیہات اور شہر کا ایسا ماحول اور منظر پیش کرتے ہیں جسے قاری خود دیکھ رہا ہو۔ان کی سیدھی سادی اور سہل زبان کے ساتھ ساتھ مکالموں کا فطری انداز بیان واقعات میں دلچسپی کا عنصر پیدا کرتا ہے۔اسلم جمشید پوری کے فن پر پریم گوپال اس طرح اظہار خیال کرتے ہیں:

> ''ڈاکٹر اسلم جمشید پوری کے افسانوں کا مطالعہ کرے ہوئے یہ احساس ہوا کہ انکے پاس افسانے بننے کے لیے اور کہنے کے لیے بہت کچھ ہے اور وہ افسانہ لکھنے کے فن سے پوری طرح واقف بھی ہیں۔ ایسے کہانی پن، سدھی ہوئی سہل اور سادہ زبان کے بل بوتے بہت ہی دلچسپ اور دل کو چھو لینے والے افسانہ لکھتے ہیں انھوں پریم چند کی طرح دیہات کو بھی بڑی کامیابی سے موضوع بنایا ہے'' 9

اس سے پتہ چلتا ہے کہ اسلم جمشید پوری کا لکھنے کا انداز سب سے جدا ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ ہر کوئی ان سے بہت جلد متاثر ہو جاتا ہے۔ان کے افسانے میں ایک الگ سا جادو ہے۔

تبسم فاطمہ:

1990 کے بعد کی افسانہ نگاروں کی فہرست میں ایک جانا پہچانا نام تبسم فاطمہ کا ہے۔ان کے افسانے قارئین میں جوش و جذبہ اور غور وفکر کی دعوت دیتے ہیں۔ان کے افسانوں میں ایک اچھوتا پن نظر آتا ہے۔ وہ ایسے افسانے لکھتی ہیں جو آج کی ہمارے سماج میں ہونے والے واقعات کو پیش کرتے ہیں جو روزمرہ زندگی میں ہمیں دیکھنے کو ملتے ہیں۔انھوں نے عورتوں کے مسائل کو اجاگر کیا ہے۔عورت پر

ہونے والے ظلم کو بیان کیا ہے۔ ڈاکٹر احمد صغیر تبسم فاطمہ کے بارے میں اکثر افسانوں میں لکھتے ہیں:

''تبسم فاطمہ کا گزشتہ کئی برسوں سے کوئی افسانہ پڑھنے کو نہیں ملا لیکن انھوں نے جو بھی افسانے لکھے ہیں وہ اپنے عہد کے موضوع مواد اور ندرت فکر وفن کی وجہ سے یاد رکھے جائیں گے۔ ان کے یہاں عورت کمزور نظر نہیں آتی بلکہ احتجاج کی ایک آواز بن کر ابھرتی ہے ظاہری طور پر یہ احتجاج مردوں کے خلاف نظر آتا ہے لیکن تبسم فاطمہ عورت کے اندر کے ڈر کو ختم کرنا چاہتی ہیں۔ عورت کمزور ناتواں ہوتی ہیں اس بھرم کو توڑنا چاہتی ہیں۔ وہ اپنے افسانوں کے ذریعہ عورت کی اندرونی طاقت کو بیدار کرنا چاہتی ہیں کہ وہ مضبوط طاقت بن کر ابھرے اور اپنے وجود کا لوہا منوائے'' [۱۰]

تبسم فاطمہ حساس طبیعت کی مالک ہیں۔ انھوں نے اپنے افسانوں کی بنیاد عورت اور سماج پر رکھی ہے۔ اس لیے ان کے یہاں آزادی نسواں کے تیور دیکھنے کو ملتے ہیں ان کی خاص خوبی یہ ہے کہ وہ عورت کی بے بسی اور لاچاری کو اپنے افسانہ کا موضوع نہیں بناتی بلکہ اس بات پر زور دیتی ہے کہ اکیسویں صدی کی عورت کو کس طرح مضبوط و مستحکم ہونا چاہئے۔ تبسم فاطمہ خواتین کے مسائل سے بے پناہ متاثر نظر آتی ہیں اس کے بارے میں وہ خود لکھتی ہیں:

''مردوں کی بالادستی کل بھی قائم تھی اور آج بھی قائم ہے میری کہانیوں کا محور شروع سے انہی موضوعات کے اردگرد چکر لگاتا رہا ہے۔ میں نے سب سے زیادہ عورت پر ہی لکھا ہے۔'' [۱۱]

وہ عورت کو صرف نیک سیرت ہی نہیں بلکہ احتجاج اور باغی بھی بنانا چاہتی ہے۔ ایک ایسی

عورت یا لڑکی جو ہر طوفان کا مقابلہ کرے اور دنیا کو بتا دے کہ عورت کسے کہتے ہیں۔اس کو اپنی طاقت کا احساس دلانا چاہتی ہیں اور مردوں کے مقابلے میں لا کھڑا کرنا چاہتی ہیں اپنی تہذیب میں رہ کر اپنے حقوق کو پامال ہونے سے بچانا اور اپنے آپ کو زمانے کا شکار ہونے سے بچانے کی طرف راغب کرتی ہیں۔ان کا افسانہ ''سیاہ لباس'' مرد کے ظلم کو توڑ کر آگے بڑھنے کو موضوع بنایا ہے افسانہ کا مرکزی کردار صحیفہ ہے جو کالج میں اپنے پروفیسر کے ہوس کا نشانہ بنتے بنتے بچ جاتی ہے۔اس واقعہ کے بعد اپنا کالج جانا بند نہیں کرتی بلکہ اس کا مقابلہ کرنے کی طرف آمادہ ہو جاتی ہے۔اس کہانی میں صحیفہ ایک باغی کردار ہے جو گھر سے باہر نکلنے والی خواتین اور لڑکیوں کے لیے سبق آموز ہے افسانے کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''صحیفہ زور سے چیخی............وہ کالج کا بوڑھا پروفیسر ہے............میں ایسے کئی دنوں سے دیکھ رہی ہوں............مگر اب............صحیفہ کی سانس الجھ گئی تھیں............گھر سے باہر نکلو تو جسے جسم پر ہزار چبھتی ہوئی آنکھیں ہوتی ہیں............پہلے سوچا تھا۔کالج چھوڑ دوں گی مگر نہیں............اب سوچ لیا جائے............کہاں جاؤں گی؟ کسی دوسرے کالج میں............؟ کیا وہاں نارائن راؤ جیسے ٹیچر نہیں ملیں گے'' [۱۲]

اس سے پتہ چلتا ہے کہ افسانے میں ایک عورت مرد سے اپنے استحصال کے خلاف لڑتی ہے۔ ایک عورت سب برداشت کر سکتی ہے مگر جب عزت کی بات آتی ہے تو برداشت نہیں کر پاتی ہے۔صحیفہ کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہوتا ہے۔اس کی برداشت اس حد کو پار کر جاتی ہے۔وہ سب سے مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو جاتی ہے۔ہر مصیبت کا سامنا کرتی ہے اور جیت حاصل کرتی ہے۔

اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ جدید افسانہ نگاروں نے اردو افسانہ کو ایک نئی سمت عطا کی۔جن

میں مرد افسانہ نگاروں کے ساتھ خواتین افسانہ نگار بھی شامل ہے۔جنھوں نے عورت کے مختلف مسائل پر بحث کر کے دنیا کے سامنے لائے ہیں۔ جو آج کے سماج میں عام طور پر خواتین کو ان مسائل سے گزرنا پڑتا ہے۔

یاسین احمد:

یوں تو ہر افسانہ نگار نے عورتوں کے مسائل پر افسانے اور مختصر افسانے تحریر کیے ہیں،خواہ ماضی کے افسانہ نگار ہوں یا حال کے اور ان افسانوں کے ذریعہ انھوں نے انسانی مسائل کے مختلف پہلو کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے جیسے بچپن کی شادی ازدواجی زندگی کی تلخیاں۔ساس اور نند کے مسائل ماں کے ساتھ بدسلوکی وغیرہ وغیرہ۔اگر ہم دور حاضر کی بات کریں تو دور حاضر کے افسانہ نگاروں میں یاسین احمد کا نام قابل قدر ہے۔جنھوں نے اپنے افسانے میں خواتین کے مختلف مسائل کی نہ صرف نشاندہی کی ہے۔ بلکہ عورتوں کے درد و کرب زندگی کی جھلکیاں اور پیچیدہ حقائق پر روشنی ڈالی ہے۔

بحیثیت افسانہ نگار ان کی حیثیت مسلم ہے۔اب تک ان کے 6 افسانوی مجموعے شائع ہو کر منظر عام پر آ چکے ہیں۔انھوں نے اپنے افسانوں کے کرداروں میں انسانی زندگی کو پیش کیا ہے۔جس میں خواتین کے مسائل بھی شامل ہیں۔

یاسین احمد کے بیشتر افسانوں میں معاشرے اور معاشرت کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔ ازدواجی زندگی کے نشیب و فراز،عورت اور مرد کی نفسیات،خواتین کے مسائل و معاملات وغیرہ کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ وہ عورت جس کا گھر بار نہیں ہے کوئی سہارا نہیں ہے غریبی کی وجہ سے فٹ پات پر سوتی ہے۔ یاسین احمد نے اس طرح کے خواتین کے مسائل کو افسانے کا حصہ بنایا ہے۔ان کا افسانہ ’’پن‘‘ میں کچھ یوں لکھتے ہیں۔

''سرکاری زچگی خانے سے کچھ دور تین چار آدمی ردی اور لکڑی کے ٹکڑے
جلا کر اپنے ہاتھ تاپ رہے تھے ان میں ایک کمزور سی بوڑھی عورت شامل تھی
جو آگ سے قریب بیٹھنے کے باوجود تھر تھر کانپ رہی تھی'' ۱۳؎

چند سطور کے بعد دوسری ایسی بے گھر غریب عورت کی زندگی کی منظر کشی کی ہے جو اپنی گود میں اولاد کو دیکھ دیکھ کر اپنی تمام تر تکلیف کو بھولنے کی کوشش کرتی ہے اور اپنی بے بسی کو دلاسہ دیتی ہے افسانے کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

''وہیں پر ایک عورت نظر آئی۔ جو میلی کچیلی ساڑی میں ملبوس اپنے بچے کو
دودھ پلا رہی تھی۔ پل کے نیچے بہتا ہوا پانی اور دور تک پھیلے ہوئے درختوں
کی وجہ سے سردی میں اور اضافہ ہو گیا تھا۔ سرد ہواؤں کے تھپیڑے اس
عورت کے کمزور جسم سے ٹکرا رہے تھے۔لیکن اپنے نوزائیدہ کو بالیدگی بخشنے کی
لازوال جستجو میں سارے احساسات کو بھلا بیٹھی تھی'' ۱۴؎

یاسین احمد نے خواتین کے صرف ایک پہلو پر ہی بات نہیں کی ہے بلکہ عورتوں کے مسائل کی مختلف جہتوں پر افسانے لکھے ہیں اور ان افسانوں میں طرح طرح کے سوالات اُٹھائے ہیں۔عورت کو جو زندگی میں پیش آتے ہیں۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ یاسین احمد نے اپنے افسانوں میں تقریباً ہر طرح کے خواتین کے مسائل کو اور اس کے مختلف جہتوں کو موضوع بنا کر سماج کو خوبصورت بنانے کا اور خواتین کے مسائل کو افسانے کا موضوع بنایا ہے۔آپ نے سماج اور معاشرہ میں خواتین کے حوالہ سے جو محسوس کیا اسے اپنی تخلیقات میں پیش کیا اور قوم کو احساس دلایا ہے۔

قمر جمالی:

اردو کی خواتین قلمکاروں میں قمر جمالی کسی تعارف کی محتاج نہیں ہیں۔ 1950ء میں حیدر آباد میں پیدا ہوئیں۔ ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''شبیہ'' کے نام سے 1990ء میں شائع ہوا۔ دوسرا مجموعہ ''سبوچہ'' 1992ء میں اور تیسرا افسانوی مجموعہ ''سحاب'' کے نام سے 2001ء میں منظر عام پر آ چکے ہیں۔

قمر جمالی کے افسانے ایک منجھی ہوئی قلمکار کے افسانے ہیں جن میں عورت کا دکھ درد اور اس کے مصائب و آلام اور اس کے استحصال کی مختلف صورتیں نظر آتی ہیں۔ کہانی کے فنی لوازمات کا بھرپور خیال رکھتے ہوئے وہ اپنے تجربے اور مشاہدے کو تخلیقی طور پر بیان کرنے پر دسترس رکھتی ہیں۔ موضوعات کی قاری کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ زبان و بیان میں دلکش پائی جاتی ہے۔

قمر جمالی عورت کے نسائی پہلوؤں کو ایک بانکپن کی صورت میں ابھارتی ہیں۔ یہ عورت کا ایک ایسا بانکپن ہے جس میں ممتا کا گزار بھی ہے؟ فریفتگی بھی، پہناوے کی تکریم بھی، عشق کی وفا شعاریاں بھی اور کسی دوسرے کے لیے اپنا سب کچھ اپنی ہی ہستی سے اعراض کرنا بھی۔ وہ عورت کی داخلی اور خارجی دنیا میں اس کا جائزہ ایک حساس عورت کی طرح لیتی ہیں اور یہ واضح کرنے کی شعوری کوشش کرتی ہیں کہ عورت پن عورت کی ترقی اور بہتر زندگی گزارنے میں کہاں حائل ہوتا ہے۔ یہاں ہم قمر جمالی کے ایک اہم افسانہ ''مدراپی کرمت ناچو سادھورام'' کو زیر بحث لانا چاہتے ہیں کہ جس میں عورت کے ظلم اور جبر کی ایک بھیانک صورت موجود ہے۔ قمر جمالی نے مذکورہ افسانے کا تانا بانا کچھ اس طرح تیار کیا ہے۔

سادھورام قمر جمالی کے افسانہ کا مرکزی کردار ہے جو ایک گاؤں کا رہنے والا عام شخص ہے ایک بار شہر کی ہوا کھاتا ہے تو شہر کی چکا چوند اسے گاؤں کی زندگی سے متنفر کر دیتی ہے۔ لوگوں کی جھوٹی تعریفیں

سن کر وہ پھولے نہیں سماتا۔ اپنے گھر کی ہر چیز اسے گندی لگتی ہے۔ گھر میں ماں گوبر کا لیپ کرتی ہے تو سادھورام ماں سے ناراض ہوجاتا ہے اسے ایسا کرنے سے منع کرتا ہے لیکن ماں اپنے بیٹے اور شوہر کو سمجھاتی ہے کہ گائے کا گوبر اور اس کا موتر پوتر ہوتا ہے اور یوں بھی تم برہمن ہو لہٰذا اس گوبر سے نفرت نہ کرو۔ سادھورام کی ماں ایک ان پڑھ، گنوار اور دقیانوسی خیال کی عورت ہے۔ جب سادھورام جوانی کے نشے میں بدمست ہونے لگتا ہے تو وہ اس گاؤں کے مکھیا کی بیٹی شنکری کو اغوا کر لیتا ہے اور اپنے ایک مل مزدور دوست کے پاس چلا جاتا ہے جو شہر میں کام کرتا ہے۔ کچھ دن ادھر ادھر بھٹکنے کے بعد سادھورام کو احساس ہوجاتا ہے کہ بغیر کام کیے ہم دونوں کا گزر بسر مشکل ہوجائے گا۔ پھر اسے مل میں مزدوری مل جاتی ہے اور ساتھ میں رہنے کے لیے کوارٹر بھی مل جاتا ہے لیکن اب وہ شراب نوشی میں مبتلا ہوجاتا ہے شنکری اسے بار بار منع کرتی ہے مگر سادھورام باز نہیں آتا۔ اس طرح شنکری اپنا رویہ بدلتی ہے اور سادھورام کو گالی گلوچ کرتی ہے وہ اب پہلے والی شنکری نہیں رہتی مگر سادھورام شنکری کو ڈنڈے سے مارتا پیٹتا ہے۔ قریب میں ایک ماسٹر رہتے ہیں جب سادھورام شراب پی کر شنکری کو ڈنڈے سے مارنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوتا ہے تو وہ دوڑتی ہوئی ماسٹر جی سے شکایت کرتی ہے ماسٹر جی کے سمجھانے پر سادھورام شراب سے توبہ کرتا ہے مگر بعد میں پھر وہی کرتا ہے کئی بار توبہ کرتا ہے کہ وہ آئندہ شراب کو ہاتھ نہیں لگائے گا۔ مگر وہ پھر شراب پیتا ہے ایک روز تمام مل مزدوروں کے ساتھ ایک تہوار کے موقع پر وہ شراب کے بدلے زہر پی لیتا ہے۔ اور اس کی بیوی شنکری دوڑتی ہوئی ماسٹر کے پاس جاتی ہے کہ سادھورام آج نہ تو بات کرتا ہے اور نہ ہی مجھے مارتا ہے اور اس طرح سادھورام ابدی نیند سو جاتا ہے۔

قمر جمالی نے افسانہ ''مدراپی کرمت ناچو سادھورام'' میں اس اہم نقطے کی صراحت کی ہے کہ انسان جوانی کے نشے میں اکثر آپے سے باہر ہوجاتا ہے۔ کسی بزرگ کا مقولہ ہے کہ جوانی دیوانی ہوتی

ہے۔ عام طور پر ہمارے سماج میں سادھورام اور شنکری جیسے کردار موجود ہیں۔ شراب پی کر عورت کی پٹائی کوئی نئی بات نہیں ہے۔ دو جنس مخالف دل یعنی مرد و عورت جب سماج کی پابندیوں کی وجہ سے آپس میں ازدواجی رشتہ قائم نہیں کر پاتے تو وہ راہِ فرار اختیار کرتے ہیں۔ عورت بہت جلد مرد کے بہکاوے میں آکر اپنا سب کچھ لٹا دیتی ہے اور جب دونوں کے دل و دماغ پر سے جوانی کا نشہ اُتر جاتا ہے تو پھر پچھتانے لگتے ہیں اور ساتھ میں تکرار شروع ہو جاتی ہے۔ سادھورام شنکری کا اغوا تو کر لیتا ہے مگر وہ اسے صحیح تحفظ نہیں دے پاتا۔ ایک تو شنکری کو اپنی بدنامی کا احساس ہے تو دوسری طرف وہ سادھورام کی محبت میں گرفتار ہے اور تیسری بات یہ کہ سادھورام اس کے پیٹ کی آگ بجھانے کی استطاعت نہیں رکھتا۔ افسانے کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

''سادھورام! تم نرے اجڈ ہو، ایک دم گنوار اور ناکارہ انسان، اپنی اردھانگی کو ایک وقت کی روٹی نہیں دے سکے......تو اس کی مانگ کو سہاگن کی سرخی کیا دے سکو گے''

شام ہوتے ہوتے شنکری کی بڑی بڑی روشن آنکھیں دھندلانے لگیں۔ اب سادھورام کو اتنا بھی حوصلہ نہ رہا کہ وہ شنکری کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھ سکتا۔ کبھی کبھی ٹھوکر آدمی کو انسان بنا دیتی ہے اور اس کے سر سے فسوں کا سودا نکل کر احساس کا پرتو یوں اجاگر کرتی ہے جیسے موٹر کے شیشے پر جمی اوس پونچھ دی گئی ہو۔

شنکری کی خوبصورت آنکھوں میں سیلاب دھمکی دیکھ کر سادھورام کو ایسی ٹھوکر لگی کہ اسے احساس ہوگیا کہ عورت جب کسی مرد پر بھروسہ کر لیتی ہے تو اسے

پرمیشور مان لیتی ہے......اور......امربیل کی طرح اس کے وجود سے یوں
لپٹ جاتی ہے کہ الگ کرنا چاہوتو وہ ٹوٹے گی ہی، مگر جب پیڑ سے وہ لپٹی
ہوتی ہے......جگہ جگہ سے اس کی چھال بھی ادھڑ جاتی ہے اس نے فیصلہ کرلیا
کہ شنکری کو اس کے ماں باپ سے علاحدہ کیا ہے تو اسکا سہارا بنے گا۔'' ۱۵؎

مندرجہ بالا اقتباس کے حوالے سے قمر جمالی کا عورت ذات کے متعلق اپنا خیال اور فلسفیانہ شعور واضح ہو جاتا ہے عشق ایک فطری جذبہ ہے عموماً نوجوان نوجوانیمیں چاہے مرد ہو یا عورت بہک جاتے ہیں ۔مرد کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ عورت کو پیار و محبت کے ساتھ ساتھ تمام زندگی کی بنیادی سہولیات فراہم کرے از دواجی رشتے بڑے نازک ہوتے ہیں۔شنکری سب کچھ برداشت کرتی وہ ایثار وقربانی کے ساتھ اپنے ساتھی سادھو رام کے ہمراہ رہنا چاہتی ہے مگر سادھو رام بری سنگت کی وجہ سے جب شراب کا عادی بن جاتا ہے تو شنکری تنگ آ کر اپنا رُعب اس پر ڈالتی ہے تا کہ وہ راہ راست پر آ جائے اس طرح محبت کا جذبہ ایک دوسرے کے دلوں سے مٹ جاتا ہے۔اور ایک مایوس کن صورتحال سامنے آتی ہے۔اقتباس ملاحظہ ہو۔

''شام دیسی ٹھراپی کر وہ گھر لوٹتا تو پتا نہیں اسے کیا ہو جاتا! کچھ یاد نہ رہتا اور
شنکری بھی کیا تھی......''
پہلی سی شنکری تو کب کے مر چکی تھی۔اتنی چرب زبان کہ بولو تو سامنے والے
کا جگر کٹ کر لہو ٹپکنے لگے۔
''حرامی کہیں کا، بڑا رعاب (رعب) جھاڑتا ہے مرد (مرد) بنا پھرتا ہے۔
شرم کر ورنہ میں اپنا پیٹ پالنے لگوں......تو تجھے باوڑی (بادلی) میں ڈوب

مرنے کے سوا چارہ نہیں۔''

نشے میں دھت سادھورام کو کچھ اور بات یاد رہے کہ نہ رہے......مگر یہ تو یاد رہتا کہ بیوی اس کی متاع ہے......اس کی لونڈی اس کا کام تو پتی دیو کے آگے سر پر بول ڈالے ہاں جی ہاں جی کرنا ہے۔ جب اس کو زبان درازی کرتی سنتا تو آپے سے باہر ہو جاتا آؤ دیکھتا نہ تاؤ۔ وارانڈے میں لگے چھپر سے ڈنڈا کھینچتا اور شروع ہو جاتا۔ ایک آدھ مار کھا کر شنکری تو ہٹ جاتی مگر نشے میں دھت سادھورام کو یہی احساس رہتا کہ وہ شنکری پر برس رہا ہے۔ بس ڈنڈا گھماتا جاتا اور ناچتا رہتا۔

''لے......حرام زادی......مر'' کھٹاک سے ڈنڈا زمین پر مارتا اور پھر پینترا بدل کر ڈنڈا ہوا میں لہراتا بیچ بیچ میں ''لے حرام زادی......مر'' کی گردان بھی کئے جاتا۔

باز و مکان سے لوگ نکل آتے اور ایک میلہ لگ جاتا۔ شنکری دوڑی دوڑی اسکول ماسٹر کے پاس جاتی جن کی سادھورام بڑی عزت کیا کرتا تھا۔ انھیں ساتھ لے آتی۔

ماسٹر جی بھی بڑی خاص مٹی کے بنے تھے۔ نہ ہی انھیں غصہ آتا اور نہ وہ سادھورام کو ڈانٹتے۔ بے خوف وہ سادھورام کے پاس جاتے، اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے اور کہتے 'مدراپی کرمت ناچو سادھورام' سادھورام یکلخت رُک جاتا۔ ماسٹر جی کی طرف دیکھتا۔ ڈنڈا ہاتھ سے چھوڑ دیتا اور کہتا۔ ''نہیں ماسٹر

جی،لوچھوڑی مدرا۔توبہ توبہ۔'' ۱۶؎

حکومت اگر سختی سے شراب بنانے اوراسے فروخت کرنے والوں اور پینے پر پابندی عائد کرے تو یقیناً ہمارا سماج بہتر ہوسکتا ہے۔

قمر جمالی نے بڑے حقیقت پسندانہ طور پر شنکری اور سادھورام کی ازدواجی زندگی کی ابتری کو اس طرح بیان کیا ہے کہ ہمیں سادھورام سے نفرت پیدا ہونے لگتی ہے اور شنکری پر رحم آنے لگتا ہے اس لیے کہ شنکری ایک مخلص اور سیدھی سادی عورت ہے جو سادھورام کے بہکاوے میں آکر اپنے ماں باپ سے محروم ہوگئی، بدنام ہوئی اور طرح طرح کی مصیبتیں برداشت کرتی رہی اوراس پر سادھورام کا براسلوک یہ تمام باتیں ایک مجبوراور بے بس عورت کی کہانی سناتی ہیں جو قاری کو نہ صرف ایک سبق دیتی ہیں بلکہ عورت کے تئیں جذبہ ہمدردی کو بھی ابھارتی ہیں۔

آشا پربھات:

آشا پربھات کے افسانے بھی بڑے دلچسپ سماجی نوعیت کے ہوتے ہیں۔انھوں نے بھی عورتوں کے استحصال کو خصوصی اہمیت دی ہے۔وہ 21 جولائی 1958ء کو ریکسول، مشرقی چمپارن بہار میں پیدا ہوئیں۔وہ بنیادی طور پر عورت کے ساتھ غیر منصفانہ سماجی رویے کو اپنے افسانوں کا موضوع بناتی ہیں۔ترنم ریاض، آشا پربھات کی افسانہ نگاری کے بارے میں ایک جگہ لکھتی ہیں:

''آشا پربھات کے افسانے سماجی نوعیت کے ہیں۔خواتین کا استحصال ان کا خصوصی موضوع ہے۔وہ اپنی کہانیوں میں ان تمام عظاسر کو بے نقاب کرتی ہیں جو عورت کے استحصال کے ذمہ دار ہیں'' ۱۷؎

''ایکوریم'' آشا پربھات کا ایک انتہائی دلچسپ اوراہم افسانہ ہے جس میں انھوں نے ایک

دوشیزہ کی عصمت دری کی کہانی بڑے فنکارانہ اسلوب میں بیان کی ہے۔اس افسانے میں شوتیا نام کی لڑکی اپنے منگیتر سشانت کی اچانک موت کے غم میں زندگی سے اداس ہو جاتی ہے اس کا باپ اپنی بیٹی کو خوش وخرم رکھنے کی فکر میں ایک دن اسے اپنے دوست انل کے پاس کلکتہ بھیج دیتا ہے تاکہ وہاں مختلف تاریخی وتمدنی مقامات کی سیر کر سکے۔شوتیا جب مسوری سے کلکتہ اپنے باپ کے گہرے دوست انل کے پاس ،پہنچتی ہے تو انل دوست کی بیٹی کو دیکھ کر کافی خوشی محسوس کرتا ہے۔اس کی بیوی رما امریکہ میں رہتی ہے اور وہ کچھ عرصہ کے لیے کلکتہ میں اپنے مکان میں آیا ہوتا ہے۔شروع شروع میں انل اپنے دوست کی بیٹی شویتا کو اپنی بیٹی کی طرح سمجھتا ہے اور اسے خوش رکھنے کی ہر ممکن کوششیں کرتا ہے۔کلکتہ کی خوبصورت جگہوں اور تاریخی عمارتوں کی سیر کراتا ہے۔لیکن اس کے باوجود شوتیا،سشانت کے ساتھ بتیائے دنوں کی یادیں بھولا نہیں پاتی ہے۔شویتا کا باپ اپنے دوست انل کو مسیحا سمجھتا ہے اس پر اسے پورا بھروسہ ہوتا ہے لیکن ایک رات یہی فرشتہ صفت انسان شیطان کا روپ دھارن کر لیتا ہے اور اپنے گہرے دوست کی بیٹی شویتا کی عصمت لوٹتا ہے اور دوسرے دن شویتا واپس اپنے باپ کے پاس مسوری چلی جاتی ہے اور جب باپ کو دیکھتی ہے تو فوراً اس کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔عورت ذات کی زندگی کتنی مایوس کن ہوتی ہے کہ قدم قدم پر اسے سماج میں دندناتے بھیڑیوں سے خطرہ ہے وہ کس طرح جیے کس طرح اپنی عزت وعصمت کی حفاظت کر سکے۔

افسانہ ''ایکوریم'' میں آشا پربھات نے فنی لوازمات کا خیال رکھتے ہوئے انسان کی زندگی میں وقت کی گردش کے جبر اور شہوت پرستی میں رشتوں کے ٹوٹنے بکھرنے کی کہانی بیان کی ہے۔افسانہ ''ایکوریم'' میں بھی آشا پربھات نے اسی طرح کی سچویشن بیان کی ہے۔زیر بحث افسانے کے ابتدائی حصے میں انل اپنے دوست کی جوان بیٹی شویتا کے ساتھ مشفقانہ برتاؤ کرتا ہے اور کہانی میں ایک نیک نیتی

کی فضا بنی رہتی ہے ایک سچی اور پر خلوص پاکیزہ محبت انل کے دل میں اپنے دوست کی بیٹی شویتا کے لیے موجزن رہتی ہے لیکن کہانی کے آخری مراحل میں انل کا خلوص اور انسانیت مفقود ہو جاتی ہے اور وہ شیطان بن کر اپنے دوست کی جوان بیٹی کی عصمت لوٹتا ہے۔ افسانے کا اقتباس ملاحظہ ہو۔

''کمرے میں آکر کپڑے چینج کر کے فوراً بستر پر لیٹ گئی۔ بیڈ سوئچ دبا کر لائٹ آف کی اور چادر سینے تک کھینچ لی۔ نیند کب آئی پتہ ہی نہ چلا۔ دفعتاً ایسا محسوس ہوا جیسے میرا پورا جسم کسی اژدہے کی لپیٹ میں آ گیا ہے۔ سانسیں رک گئی ہیں۔ زور لگا کر اژدہے کو جھٹکنے کی کوشش کی تو جکڑن اور بڑھ گئی چیخنے کی کوشش کی......فوراً ایک ہتھیلی میرے منہ پر آ پڑی......چھٹپٹاہٹ سے پکڑ کچھ ڈھیلی پڑی......فوراً میں نے ٹٹول کر بیڈ سوئچ دبا دیا روشنی کے ساتھ ہی میری آنکھیں یہ دیکھ کر حیران رہ گئیں کہ بستر پر وہ تھے۔ ان کی آغوش میں میں قید تھی۔ کمرے میں ہر سو پاپا کے یقین......میرے اعتقاد اور ان کے امیج کی دھجیاں اڑ رہی تھیں۔ محسوس ہوا جیسے اس لمحے وہ صرف ایک مرد تھے اور ان کے لیے میں صرف ایک عورت، مسیحا کے چہرے پر شیطان کا چہرہ چسپاں تھا۔ جگر میں نیزہ سا چبھا اور درد سے آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔ کاش کل ہی میں یہاں سے چلی گئی ہوتی تو یہ سب کچھ دیکھنے کو نہ ملتا۔'' ۱۸؎

مندرجہ بالا اقتباس میں جس واقعے کا ذکر ہے وہ انسان بالخصوص مرد کی ایک گھناؤنی اور اخلاق سوز حرکت کو ظاہر کرتا ہے۔ آشا پربھات کا فن اس افسانے میں اپنے کمال کو پہنچ چکا ہے۔ عورت جب مرد کی گرفت میں آتی ہے تو اس کی حیثیت اس مچھلی سے زیادہ اور کچھ نہیں ہوتی جو پانی سے باہر نکالنے کے

بعد تڑپ تڑپ کر دم توڑ دیتی ہے۔ شویتا کو پہلے یہ یقین نہیں تھا کہ اس کے پاپا کا دوست انل رات کی تنہائی اور تاریکی میں اس کی عزت لوٹے گا۔ لیکن جب وہ اپنی حیوان پن کا مظاہرہ کرتا ہے تو اعتماد اور بھروسے کو سخت ٹھیس پہنچتی ہے۔ آشا پربھات کی نظر میں عورت کا وجود کمزور اور نازک ہے عورت سماج میں قدم قدم پہ مجبور ہے وہ نہ تو شادی سے قبل محفوظ ہے اور نہ شادی کے بعد۔ مرد کی پہلی نظر عورت پہ ہوس کی ہوتی ہے۔ مردوں کے استحصالی رویے نے عورت کو پستی و ذلالت کے گھڑے میں ڈال دیا ہے۔ لیکن اب تقریباً عورت نے مرد کے ان تمام ہتھکنڈوں کو بہتر طور پر جان لیا ہے۔ اور وہ ان سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کر رہی ہے۔ مگر وہ اس معاملے میں ابھی پوری طرح کامیاب نہیں ہوئی ہے۔ ابھی اسے مردانہ سماج سے بہت سے اپنے مطالبات منوانے باقی ہیں۔

قمر جہاں:

نسائی ادب میں قمر جہاں بھی ایک اہم نام ہے ان کی ادب میں دوحیثیت ہے وہ ایک نقاد بھی ہیں اور افسانہ نگار کی حیثیت سے بھی مشہور ہیں۔ قمر جہاں 1948ء میں دربھنگہ (بہار) میں پیدا ہوئیں۔ جہاں تک قمر جہاں کی افسانہ نگاری میں تانیثی شعور کا تعلق ہے ان کے افسانے نہ صرف لسانی خیالات و جذبات پر مبنی ہوتے ہیں بلکہ وہ سائنسی، صنعتی اور تکنیکی دور کی اس تیز رفتار زندگی میں عورت کے ٹوٹتے بکھرتے وجود کی بھی عکاسی کرتی ہیں۔ آج جب کہ عورت زندگی کے ہر شعبے میں اپنی ذہانت اور لیاقت کے جوہر دکھا چکی ہے۔ لیکن اس سائنسی، صنعتی اور تکنیکی دور نے بہت حد تک اس کی خانگی زندگی کو درہم برہم کر دیا ہے قمر جہاں نے اپنے افسانوں میں عصر حاضر کی عورت کے گوناگوں مسائل اور مردوں کے ظلم وستم کو بیان کیا ہے۔ یعنی آج کی عورت روایت اجبار کی شکار تو نہیں لیکن مرد نے اس کے استحصال کی نئی نئی صورتیں وضع کی ہیں۔ بقول وہاب اشرفی:

''......ان کے افسانوں میں عورتوں کے مسائل پر خصوصی توجہ ملتی ہے۔ وہ اپنے کینوس کو وسیع تر کرتے ہوئے عمومی زندگی کی تصویر کشی بھی بطریق احسن کرتی ہیں۔ ان کا کوئی بھی افسانہ پیچیدہ یا مبہم نہیں لیکن راست بیانیہ غیر وقیع نہیں۔ ان کے افسانوں میں تہ داری کی تلاش فعل عبث ہوگی۔ وہ بڑے معصوم انداز سے عام انسانوں کی داخلی اور خارجی زندگی کی تصویر کشی کرتی ہیں۔'' ۱۹

''آج کی عورت'' قمر جہاں کا ایک شاہکار افسانہ ہے جو موجودہ دور کی عورت کے مسائل اور اس کی الجھنوں کو محیط ہے۔قمر جہاں نے مذکورہ افسانے کا تانا بانا بڑی ہنر مندی سے تیار کیا ہے۔اس افسانے کی کہانی ایک ایسی عورت کے اردگرد گھومتی ہے جو سرکاری ملازمت کرتی ہے۔ ایک کالج میں لائبریرین کے عہدے پر کام کرتی ہے۔گھر میں بچوں کے کپڑے کھانے پینے کی چیزوں کو تیار کرنے اور مختلف طرح کے گھریلو کام کاج میں اس قدر منہمک ہوجاتی ہے کہ اپنی ڈیوٹی پہ اکثر تاخیر سے پہنچتی ہے۔ جس کی وجہ سے اس کی باس اسے گالی دیتی ہے۔ وہ ہر روز کوئی نہ کوئی بہانہ تلاش کر لیتی ہے اور اپنی باس کو یقین دلانے کی کوشش کرتی ہے۔لیکن باس بھی سخت مزاج ہے وہ اسے سب کے سامنے جھڑکتی ہے۔ یہ عورت دل مسوس کر رہ جاتی ہے آنسو پی لیتی ہے اور آہوں میں اپنے دل کی بھڑاس نکال لیتی ہے۔ایک دن اس لائبریرین کا بچہ سخت بیمار ہوجاتا ہے اور وہ اپنے بچے کو پیار بھرے بول سناتی ہوئی بچے کو اپنی ساس کے حوالے کر کے دفتر چلی جاتی ہے ذہنی بے چینی اور تناؤ کی وجہ سے دفتری کام میں غلطی کر جاتی ہے اور اس کی باس اس پر برس پڑتی ہے۔تب یہ عورت اپنے بچہ کے بیمار ہونے کا ذکر کرتی ہے جسے اس کی باس ایک نیا بہانہ سمجھتی ہے۔ بالآخر وہ آدھے دن کی چھٹی لے کر گھر پہنچتی ہے تو ساس اس پر برس پڑتی ہے۔

اس طرح قمر جہاں کا افسانہ انتہائی دلچسپ اور سبق آموز ہے جس کا مرکزی خیال یہ ہے کہ عصر حاضر کی ملازمت پیشہ عورت گھریلو کاموں اور پھر دفتری کاموں میں کتنی ٹوٹتی بکھرتی اور ذہنی وجسمانی تھکان محسوس کرتی ہے لیکن اس کے باوجود کوئی بھی اس پر خوش نہیں ہے۔ آج کی عورت دوہری ذمہ داری نبھارہی ہے اوراس صورت میں اس کی حالت قبل رحم ہے۔ لیکن مرد بالا دستی والے سماج کے پاس انصاف والی آنکھیں نہیں ہیں۔

افسانہ ''آج کی عورت'' کا المیہ یہ ہے کہ وہ عورت لائبریرین ہے اور کالج میں زیر تعلیم کثیر طلبہ و طالبات کو کتابیں فراہم کرتے اور ان سے واپس کتابیں لیتے لیتے وہ انتہائی طور پر تھک ہار جاتی ہے سرکاری نوکری کو پہرہ دیتے ہوئے وہ بور ہو جاتی ہے۔ افسانے کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

> ''دن بھر ایک انداز میں بیٹھی بیٹھی وہ بالکل بور ہو جاتی تھی۔ اسے اپنا کمرہ ایک چھوٹا سا قید خانہ لگتا تھا۔ اس قید خانہ میں اس کی کرسی کے سامنے کی طرف ایک چھوتی سی کھڑکی تھی۔ اس کھڑکی کی سلاخیں اس انداز میں کٹی ہوئی تھیں جس سے لڑکیاں دن بھر لائبریری کارڈ لینے کے لیے اپنے ہاتھ اندر بڑھایا کرتی تھی اوراسی راستہ سے وہ کتاب بھی لیتی دیتی تھیں۔ دن بھر طرح طرح کی لڑکیاں، کوئی الٹراماڈرن، کوئی سیدھی سادی، کوئی خوبصورت، کوئی بدصورت، کوئی بش شرٹ پتلون میں ملبوس، کوئی شلوار جمپر میں، کوئی ساڑی میں ملبوس، اس دریچہ کے اس پار چھوٹےسے کمرے میں آکر کھڑی ہو جاتیں اور اپنے شوروغل سے اس کے ذہن کو پراگندہ کرتی رہتیں۔'' [۲۰]

سارا دن ایک مخصوص جگہ پر بیٹھے بیٹھے اور کالج کی لڑکیوں کو کتابیں دیتے اور واپس لیتے لیتے

یہ عورت بالکل تھک جاتی ہے اب ظاہر ہے گھر میں پہنچ کر اسے آرام کرنا چاہیے مگر گھر پہنچتے ہی ساس کی بے رخی اور بچوں کی فرمائشیں، ان کا شورا سے اور پریشان کرتے ہیں کبھی کبھی شوہر کے دوست گھر پر آتے ہیں تو ان کے لیے چائے اور روٹی کا انتظام کرنا یہ سارا معاملہ اس عورت سے جڑا ہوا ہے اب آرام کہاں اور چین کہاں۔قمر جہاں نے آج کی ملازمت پیشہ عورت کی الجھنیں اور اس کی دوہری ذمہ داری کی جو تصویر مذکورہ افسانے میں پیش کی ہے وہ انتہائی موثر اور غور طلب ہے۔ یہ مشاہدے کی بات ہے کہ جن گھروں کی عورتیں ملازمت کرتی ہیں انھیں کئی الجھنوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وہ جب گھر سے اپنی ڈیوٹی پر نکلتی ہیں تو ان کے بچے ان کا دامن پکڑ لیتے ہیں راستہ روکنے لگتے ہیں، چیختے چلاتے ہیں اور ماں کی ممتا ڈھونڈتے ہیں جو ان کا پیدائشی حق ہے۔مگر عورت کو پورے وقت پر اپنی ڈیوٹی پر حاضر ہونا ہوتا ہے۔اسی کشمکش میں بچوں کی صحیح پرورش اور نگرانی نہیں ہوتی ہے۔افسانہ ’’آج کی عورت‘‘ میں بھی ایک جگہ قمر جہاں نے عورت کے ایک ایسے پہلو کی طرف اشارہ کیا ہے جس کا تعلق اس کی مجبوری سے ہے اور غور طلب بات یہ کہ ایسے نازک موقعوں پر عورت کے دل پر کیا کچھ گزرتی ہوگی۔افسانے کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

> ’’لیکن آج کے واقعہ نے تو اسے تلملا ہی دیا ہے اس کا سب سے چھوٹا بچہ بخار سے بھن رہا ہے۔اس کی خواہش کالج جانے کی نہیں ہو رہی ہے لیکن اس کے پاس ایک بھی کیزوئل لیو(Casual Leave)نہیں ہے اگر وہ چھٹی لے گی تو تنخواہ کٹ جائے گی۔اس نے سوچا کہ وہ جا کر اپنے باس کو اپنے حالات بتائے گی اور تھوڑی دیر کام کرنے کے بعد باس کی اجازت لے کر گھر چلی آئے گی۔اس طرح تنخواہ کٹنے سے بچ جائے گی۔ وہ ساس سے کہہ

> گئی......''اماں میں بارہ بجے تک آجاؤں گی۔ جب تک آپ بابو کو بہلائیں گی۔'' جاتے وقت بچہ اس کی ساڑی کا آنچل نہیں چھوڑتا ہے وہ بڑے پیار سے اس کی معصوم پیشانی کو چومتی ہے اور گردن اور ہونٹ پر بوسہ دیتے ہوئے کہتی ہے......''میرے منا......میں ابھی آجاتی ہوں......تمہارے لیے دوا اور بسکٹ بھی تو لانا ہے۔ پاپا تو نہیں ہیں نا بیٹے، اس لیے دوا اور بسکٹ کون لائے گا میرے منا کے لیے۔'' ۲۱

یہ ممتا بھرے الفاظ اس عورت کے ہیں جس کا بچہ بخار سے تڑپ رہا ہے اور وہ اسے مجبوراً اپنی ساس کے حوالے کرتی ہے مگر بچہ ماں کو اپنی آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے کے لیے فوراً اس کی ساڑی کا آنچل پکڑ لیتا ہے۔ اس طرح یہ عورت جسے بروقت اپنی ڈیوٹی پر حاضر ہونے کی فکر ستا رہی ہے تو دوسری طرف بچے کی محبت اور اس کی صحت ناساز ہونے کی فکر ایک عجیب قسم کی کشمکش میں مبتلا کرتی ہے۔ قمر جہاں نے عورت کی نفسیات اور اس کی تمام حرکات و کیفیات کو ایک فطری انداز میں اس طرح پیش کیا ہے کہ جیسے یہ ہماری اپنی گھریلو اور دفتری زندگی کا معاملہ ہو۔

افسانہ'' آج کی عورت'' میں افسانہ نگار نے عصر حاضر کی عورت کی جو بھاگ دوڑ دکھائی ہے وہ اس بات کا سراغ فراہم کرتی ہے کہ مردانہ سماج کے وضع کردہ اصولوں اور روایات کے خلاف اگرچہ عورت نے بغاوت کا اعلان کر دیا ہے لیکن اس کے بدلے میں اسے بہت سی الجھنوں اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اور وہ آئے دن ذمہ داریوں کے بوجھ تلے دبتی چلی جا رہی ہے۔

غزال ضیغم:

غزال ضیغم کا شمار عصمت چغتائی کی طرح بولڈ افسانہ لکھنے والوں میں ہوتا ہے۔ ان کی ادبی

زندگی کا آغاز 1990 سے ہوا اور اب تک جاری ہے ان کے کئی مضامین اور افسانے منظر عام پر آ چکے ہیں۔غزال ضیغم کے افسانوں میں مردوں کے خلاف کھل کر احتجاج ملتا ہے۔عورتوں کے جنسی استحصال کا بھی وہ بڑی بے باکی کے ساتھ ذکر کرتی ہیں۔اس کے ساتھ ہی وہ عورتوں کو ایک پیغام بھی دیتی ہے کہ وہ بھی آزاد ہیں اور مرد کے شانہ بہ شانہ چل سکتی ہیں۔انھیں بھی مساوی درجہ حاصل ہے۔انھوں نے اپنے افسانوں میں جن موضوعات و مسائل کو جگہ دی ہے ان میں سے زیادہ تر عورتوں کے مسائل اور ان کی نفسیات کی پیش کش سے متعلق ہے۔بلاشبہ غزال ضیغم ایک ایسی افسانہ نگار ہیں جن کے حساس دل نے اپنے گرد و پیش کے مناظر کو بڑے غور سے دیکھا ہے اور ان کا گہرا مشاہدہ بھی کیا ہے۔اپنے افسانوں نکے ذریعہ انھوں نے کوشش کی ہے کہ کچھ ایسی چیزیں سامنے آئے جن سے جو تہذیبی گراوٹ کی خلا پیدا ہو رہی ہے وہ دور ہو سکے۔ان کے افسانوں میں عورتوں کی حقیقی زندگی کی دھڑکنیں سننے کو ملتی ہیں۔انھوں نے عورتوں پر ہو رہے جبر و استبداد کو جذباتی انداز میں اپنے افسانوں میں بیان کیا ہے اور ساتھ ہی یہ سوال بھی اٹھایا ہے کہ آخر کب تک مرد عورتوں پر حاکم رہیں گے اور عورتیں ان کی غلام بنی رہیں گی۔غزال ضیغم کو اس بات کا احساس ہے کہ مرد کے بنائے ہوئے نظام میں عورتوں کے ساتھ ناانصافی ہوتی ہے۔وہ عورتوں کی موجودہ صورتحال میں تبدیلی چاہتی ہیں اور ایک نئے سماج کی تشکیل کرنا چاہتی ہیں جہاں عورت کو بھی برابری کا درجہ حاصل ہو۔

ان کا ایک افسانہ ''خوشبو'' ہے۔اس افسانے میں بھائی بہن کی محبت اور عورتوں پر مرد کی اجارہ داری کو موضوع بنایا گیا ہے۔اس افسانے میں پپو نام کا ایک لڑکا ہے جو اپنی بہن سے بہت پیار کرتا ہے جب اس کی شادی ہو جاتی ہے اور وہ بیاہ کر لندن چلی جاتی ہے تو پپو اپنی بہن کو بہت یاد کرتا ہے اور سوچتا رہتا ہے کہ اس کی بہن کیسے لندن میں رہتی ہوگی، نہ تو وہاں گاؤں جیسا ماحول ہوگا اور نہ اس جیسا

گھر، نہ کھیت کھلیان ہوگا اور نہ گاؤں کی سوندھی مٹی کی خوشبو۔ وہ اپنی بہن کے بہت قریب تھا جیسا کہ وہ کہتا ہے:

''میری اماں مجھے جنم دیتے ہی گزر گئی۔ مجھے میری بہن نے اپنے بچے کی طرح پالا پوسا۔ حالاں کہ وہ مجھ سے صرف آٹھ سال بڑی ہے لیکن مجھ سے بزرگوں جیسا برتاؤ رکھتی ہے۔ وہ مجھے آج بھی بچہ سمجھتی ہے جب کہ میں اٹھائیس سال کا اچھا خاصہ میچورلڑکا ہوں۔ ایک فرم میں اکاؤنٹ سیکشن کا کام بھی کر رہا ہوں۔'' ۲۲

پپو کی بہن کی جب شادی ہوئی تھی وہ بہت چھوٹا تھا۔ اس وقت وہ بہت خوش تھا کہ وہ جب گھر سے چلی جائے گی تو مجھے کوئی ڈانٹنے والا نہیں ہوگا۔ وہ اپنے بہنوئی کو بالکل پسند نہیں کرتا تھا اور سوچتا تھا کہ میری نرم نازک بہن اس موٹے اور کالے کلوٹے کے ساتھ کیسے پوری زندگی گزارے گی۔ کچھ عرصے بعد پپو اپنی بہن کے گھر جاتا ہے تو دیکھتا ہے کہ اس کی بہن اپنے شوہر کی مرضی سے ہر کام کرتی ہے اور اسے خوش رکھنے کی پوری کوشش کرتی ہے ہر وقت اپنے شوہر کی حکم بجالاتی ہے جسے دیکھ کر پپو کو لگتا ہے کہ اس کی بہن کی زندگی اجیرن ہوگئی ہے اور وہ ایک نوکرانی بن کر رہ گئی ہے۔ شادی سے اسے خوشی نہیں ملی بلکہ اس کے حصے میں غلامی آئی ہے۔

*****

حواشی

۱۔ غیر مطبوعہ مضمون/نور الحسنین/ص:23

۲۔ اردو افسانہ کا تنقیدی جائزہ 1980 کے بعد/ احمد صغیر/ص:148

۳۔ قمر رئیس، پیش گفتار، مشمولہ: عکس، از نگار عظیم (بٹلہ ہاؤس جامعہ نگر اوکھلا، نئی دہلی 1990)ص:4

۴۔ اردو افسانہ کا تنقیدی جائزہ 1980 کے بعد/ احمد صغیر/ص:208

۵۔ افسانہ ''تعفن'' افسانوی مجموعہ درمیان کوئی تو ہے۔/ص:21

۶۔ افسانہ ''گونگی'' افسانوی مجموعہ ایک تنگ زمین/ ترنم ریاض/ص:124

۷۔ افسانہ ''خلش بے نام سی'' / صادقہ نواب سحر/ص:128

۸۔ افسانہ ''افق کی مسکراہٹ'' افسانوی مجموعہ افق کی مسکراہٹ/ اسلم جمشید پوری/ص:54

۹۔ ''کہانی محفل کی'' از پریم گوپال/ص:18

۱۰۔ اردو افسانہ کا تنقیدی جائزہ 1980 کے بعد/ احمد صغیر/ص:295

۱۱۔ غیر مطبوعہ مضمون، تبسم فاطمہ/ص:8

۱۲۔ افسانہ ''سیاہ لباس'' از تبسم فاطمہ/ص:15

۱۳۔ افسانہ ''پن'' از یاسین احمد/ افسانوی مجموعہ دھار/ص:71

۱۴۔ ایضاً 72

۱۵۔ قمر جمالی، مدراپی کرامت ناچو سادھو رام،/ص:57

۱۶۔ ایضاً 60-61

۱۷ے ترنم ریاض، بیسویں صدی میں خواتین کا اردو ادب/ص:313

۱۸ے ایضاً 122-123

۱۹ے پروفیسر وہاب اشرفی، تاریخ ادب اردو (جلد سوم) ص:135

۲۰ے ''آج کی عورت'' مشمولہ: بہار میں اردو افسانہ نگاری/ص:682

۲۱ے ایضاً 684

۲۲ے غزال ضیغم، ایک ٹکڑا دھوپ کا/ص:27

باب سوم
غضنفر کے افسانوں میں خواتین کے مسائل

غضنفر کے افسانوں میں خواتین کے مسائل

انسان اور سماج ایک دوسرے سے ایسے جڑے ہوئے ہیں کہ ان کے انفرادی وجود کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ سماج اور خاندان مرد اور عورت کے باہمی تعلقات سے بنتے ہیں۔ انسان جس سماج میں آنکھیں کھولتا ہے پلتا بڑھتا ہے اس میں اسے مختلف طرح کی پریشانیوں کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ سماج سے جڑے خاندان اور اس سے جڑے افراد کے بھی اپنے منفرد مسائل ہوتے ہیں۔

غضنفر کے افسانوں میں عورتوں کی حیثیت اور ان کے سیاسی، سماجی، اخلاقی مسائل کی عکاسی نمایاں طور پر ملتی ہے۔ ان افسانوں میں عورتوں کے مختلف طبقے اور مسائل اور ان کی سماجی حیثیت کو افسانہ نگاروں نے مختلف زاویہ نظر سے دیکھا اور پیش کیا ہے۔ عورت اور مرد کے رشتوں کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی سماجی تناظر میں منظر عام پر آنے والے سبھی افسانوں میں ملتے ہیں۔ ان افسانوں میں سماج اور ماحول کے علاوہ خواتین مسائل اور سماجی و معاشی حیثیت کی عکاسی بھی ملتی ہے اور ساتھ میں سرمایہ دارانہ نظام میں ان کے استحصال کی تصویر کشی بھی دیکھائی دیتی ہے۔

سماج سے جڑے خواتین کے مسائل کو پیش کرنا ہی مقالے کا اہم مقصد ہے۔ عورت جو سماج میں مختلف مسائل کا سامنا کرتی ہے۔ پیدائش سے لے کر بچپن پھر جوانی اور بڑھاپے تک اس کی زندگی میں بے شمار ایسے حادثات پیش آتے رہتے ہیں کہ اس کا وجود ہی متزلزل ہوجاتا ہے۔ لڑکی کی پیدائش پر زندہ درگور کرنے کی مصیبت، اس سے بچ کر نکلے تو بچپن کی شادی آجاتی ہے۔ اس میں بیوہ کی زندگی بھی گزارنی پڑتی ہے۔ اکثر ظلم وستم، طنز ایثار وقربانی وغیرہ کا نشانہ بنتی ہے۔ جب اعلیٰ تعلیم کی بات آتی ہے تو تعلیم حاصل کرنا بھی ایک بڑا مسئلہ بن جاتا ہے۔ عام سوچ یہ ہوتی ہے کہ لڑکیاں اعلیٰ تعلیم حاصل نہیں

کرسکتی ۔ پھر وہ چاہیں کتنی بھی ذہین ہو اور وہ چپ چاپ برداشت بھی کر لیتی ہیں۔ اس سے زیادہ تعلیم حاصل کر لینے پر شادی کا مسئلہ درپیش آتا ہے۔ اس کے علاوہ من پسند اور بے جوڑ شادی بھی ہمارے سماج کا ایک اہم مسئلہ ہے۔ آج کے موجودہ دور میں سب سے بڑا مسئلہ جو سامنے آتا ہے وہ ہے جہیز کا مسئلہ آج کل تو جہیز کے مطالبات دلہن والوں کی طرف سے پورے نہ ہونے پر اور لڑکے والوں کی بجا خواہشات اور بھاری رقم کے مطالبات پورے نہ ہونے پر اس نئی نویلی دلہن کو یا تو زندہ جلا دیا جاتا ہے یا پھر زندہ لاش بنکر گھٹ گھٹ کر مرنے کے لیے مجبور کر دیا جاتا ہے۔ عورتوں کو کئی دفعہ جہیز کی کمی بیشی یا پھر دولہے کی جانب سے کئے گئے غیر ضروری مطالبات کی وجہ سے زندگی سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔ بعض اس سے بیزار ہو کر کوٹھے کا سہارا لیتی ہیں اور طوائف یا کال گرل بن کر آزاد زندگی گزارنا پسند کرتی ہیں۔ آج کے زمانے میں اگر کوئی غریب گھرانے سے شادی کر کے سسرال آتی ہے تو اسے سسرال میں کئی طرح کی ذلت سہنی پڑتی ہے۔ اور جب بچے پیدا کرنے کا دور آتا ہے تو اس میں بھی عورت کو برا مانا جاتا ہے۔ اگر کسی مرد میں خرابی ہو تو اسے کبھی کچھ نہیں کہا جاتا ہے بلکہ صرف عورت کا قصور مانا جاتا ہے۔ اسی طرح اگر بچہ بگڑ جاتا ہے تو اس پر بھی عورت کو برا بھلا کہتے ہیں۔ غرض کہ عورت کو پیدائش سے لے کر موت تک کئی ایک مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

افسانہ ادب کی ایک ایسی صنف ہے جو اپنی کارکردگی اور سرگرمیوں کے باعث ایک متاثر کن فعال اور بہت حد تک متحرک صنف ہے۔ اردو فکشن نے پریم چند کے بعد متواتر عروج کے منازل طے کیے اور ترقی پسند تحریک، جدیدیت سے ہوتے ہوئے آج مابعد جدیدیت تک اردو فکشن میں بھی کئی تجربات ہوئے۔ جدت پسندی کے عہد میں حسین الحق، شوکت حیات، شفق اور عبدالصمد کا نام ہمیشہ اہمیت کا حامل رہا۔ اس گروپ کے فوراً بعد جن لوگوں نے بڑی تیزی سے اپنی جگہ اردو فکشن میں بنائی ان

میں غضنفر کا نام قابل ذکر ہے۔

یوں تو ان سے پہلے بہت سے افسانہ نگاروں نے افسانے لکھیں ہیں اور لکھ بھی رہے ہیں مگر غضنفر کا لکھنے کا انداز سب سے الگ اور انوکھا ہے۔ان کی افسانے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہوتی ہے کہ جب وہ افسانہ لکھتے ہیں اس میں ڈوب کر لکھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ انھوں نے قاری کو اپنی طرف متوجہ کیا اور قارئین نے بھی ان کو یہ کہہ کر قبول کیا کہ اردو دنیا میں ایک نئے فنکار کا ورد ہوا ہے جس کے پاس نئے موضوعات کے ساتھ قاری کو لبھانے کے لیے دلچسپ طریقے بھی موجود ہیں۔

غضنفر کئی اعتبار سے ایک معتبر شخص کی حیثیت رکھتے ہیں۔فکشن، تدریس، تنقید، شاعری، خاکہ نگاری، ڈرامہ غرض زبان وادب کے تقریباً ہر پہلو پر ان کے یہاں اظہار خیال ملتا ہے۔غضنفر نے ادبی منظر نامے پر تو اپنا سفر بحیثیت ڈرامہ نگار اور تنقید نگار سے شروع کیا ہے لیکن سب سے زیادہ شہرت انھیں ناول نگاری سے ملی۔ایک معروف ناول نگار ہوتے ہوئے بھی انھوں نے افسانے لکھے۔اب تک ان کے دو افسانوی مجموعے ''حیرت فروش'' 2005ء اور ''پارکنگ ایریا'' 2015ء منظر عام پر آچکے ہیں۔ ''حیرت فروش'' میں 32 اور ''پارکنگ ایریا'' میں 20 افسانے موجود ہے۔یہ افسانے اپنے آپ میں لاجواب ہیں۔ہر ایک میں سبق آموز باتیں ہوتی ہیں۔ان کے افسانوں کا مطالعہ یہ ثابت کرتا ہے کہ غضنفر نے موضوعاتی سطح پر بھلے ہی کوئی انقلاب برپا نہ کیا ہو مگر موضوعات کے treatment کا نیا پن انھیں موضوعاتی سطح پر اپنے ہمعصروں سے منفرد بناتا ہے اور اسلوبیاتی سطح پر بھی وہ اپنے ہمعصروں کے مقابلے جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں۔

ادب کے بیشتر افسانہ نگاروں نے عورتوں کو موضوع بنایا لیکن غضنفر کا انداز ان سب سے الگ ہے۔وہ اپنے افسانوں میں زندہ کردار کو پیش کرتے ہیں کبھی وہ عورت کو مرد کے سامنے کھڑا کر دیتے ہیں

کبھی مرد کو عورت کے سامنے۔ اسی پہلو میں ان کا ایک مشہور افسانہ ''ہاؤس ہوسٹس'' ہے جو ان کے افسانوی مجموعہ ''حیرت فروش'' میں شامل ہے۔ یہ افسانہ اس نقطۂ نظر سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے کہ اس میں عورت اس شئے کا نام ہو چکا ہے جو ہر کسی کے لیے صرف خوشیوں کا باعث بن سکے لیکن وہ کسی کی سچی محبت کی خوبیاں نہ ہو۔

غضنفر اس کو کچھ اس انداز میں بیان کرتے ہیں کہ خواہ وہ ایر ہوسٹس ہو یا روبوٹ کی شکل میں ہاؤس ہاسٹس ہو جس طرح ایر ہاسٹس جو بظاہر جہاز پر خوش تو رہتی ہیں اور دوسروں کو خوشی بھی دیتی ہیں لیکن اپنے گھروں میں ان کا چہرہ پھیکا رہتا ہے۔ گھر پر اسے ہر طرح کی مصیبت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کبھی شوہر کا کبھی بچوں کا تو کبھی سسرال والوں کا لیکن ہمارا سماج ان کے چہروں کے پھیکے پن کے بجائے ان کے چہروں کی تمانیت کو پسند کرتا ہے۔ اسے ہمیشہ ہنستا ہوا دیکھنا پسند کرتا ہے اور وہ مجبور ہو کر سب کے سامنے ہنستی رہتی ہے۔ خواہ یہ عورت داخل سے غم زدہ ہی کیوں نہ ہو غرض کہ عورت اپنے دکھ کا اظہار نہیں کر سکتی ہے۔ ان کے پاس زبان و جذبات ہو لیکن ان سے ان کا خود سروکار نہ ہو۔ یہ عورت دوسروں کے آگے اشاروں پر چلنے والی بے جان چابی کی گڑیا سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی ہے نہ تو وہ اپنی خواہش کا اظہار کر سکتی ہے نہ وہ کچھ بول سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان عورتوں کے داخل میں جھانک کر دیکھنے والا کوئی نہیں ہے کہ ان کا دل کیا کہہ رہا ہے ان میں بھی جان ہے انھیں بھی تکلیف ہوتی ہے۔

اس افسانے میں ایک ہاؤس ہوسٹس کی کہانی کو بیان کیا گیا ہے جو کہ مسٹر چوپڑا کے گھر میں اپنی خدمات انجام دے رہی ہے۔ بظاہر اس افسانے میں ہاؤس ہوسٹس پر کوئی ظلم و جبر نہیں ہو رہا ہے لیکن اس کہانی کے ذریعہ ایک خاتون کے اندرنی مسائل کو دکھانے کی کوشش کی گئی ہے جب کبھی کوئی عورت پر ظلم ہوتا ہے تو لوگ اس پر انگلی اٹھاتے ہیں مگر اندرونی مسائل کو کوئی نہیں دیکھتا ہے۔ وہ اندر ہی اندر اس مسائل

سے جوجھتی رہتی ہے۔ بچوں کی فکر اس کے ذہن میں ہمیشہ رہتی ہے وہ کسی طرح سے اپنے ذہن سے خالی نہیں ہو پاتی ہے۔ افسانے کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''دیکھو بیٹے ٹھیک سے اسکول جانا راستے میں کہیں ادھر ادھر نہ رکنا چھٹی ہونے پر سیدھے گھر پہنچنا لنچ ٹائم میں لنچ ضرور کھا لینا۔ بھولنا نہیں۔ پیاس لگے تو پانی صرف اپنی بوتل کا پینا۔ اور سنو ایک قدم آگے بڑھ کر اس نے بچے کی پیشانی پر ایک پیار بھرا بوسہ ثبت کر دیا'' [1]

اس اقتباس کے ذریعہ ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ خاتون جو کہ ظاہری طور پر بہت خوش نظر آ رہی ہے لیکن اپنے بچے کی فکر اندر ہی اندر ستا رہی ہے۔ ہمیشہ اس کے ذہن پر یہ خیال رہتا ہے کہ میرا بچہ اسکول میں ٹھیک تو ہے اس نے کھایا یا نہیں۔ دوسروں کے لیے وہ صرف ایک کام کرنے والی ہے۔ لیکن اس کے نازک کندھوں پر ایک بچے کی ذمہ داری ہے جو دنیا کی سب سے بڑی ذمہ داری ہوتی ہے۔ جس کی وجہ سے عورت ہر درد و غم، تکلیف برداشت کرنے پر تیار ہو جاتی ہے۔ مرد جب کوئی کام کرتا ہے تو اسے کام کہتے ہیں اور اسے داد بھی دیتے ہیں مگر وہی کام جب ایک عورت کرتی ہے اسے عجیب نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ اس افسانے میں عورت کا دوسروں کے گھروں میں کام کرنا اس کا شوق نہیں ہے بلکہ اس پر اس کے گھر کی ذمہ داریاں اسے ایسا کرنے کے لیے مجبور کر دیتی ہے۔

اس افسانے میں غضنفر نے اس بات کو بھی دکھانے کی کوشش کی ہے کہ سماج میں عورت کو کس نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ جو عورت گھر سے باہر کام کرتی ہے مرد اسے صرف ایک دل بہلانے کی چیز سمجھتے ہیں۔ اسے ایک خوبصورت چیز سمجھ کر اس کے حسن سے لذت حاصل کی جاتی ہے۔ اس کا وجود انسان کا وجود نہیں بلکہ وہ تو محض ایک خوبصورت شئے ہے جسے دیکھ دیکھ کر انسان لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اقتباس

ملاحظہ ہو:

''ایک نہایت حسین وجمیل دوشیزہ نے جاں بخش مسکراہٹ سے استقبال کیا۔ مسٹر چوپڑا کی نگاہیں دوشیزہ کے مقناطیسی رنگ وروپ پر کسی کمزور لوہے کی طرح فوراً چپک گئیں۔ متناسب، سڈول، شگفتہ، شاداب اور پرآب جسم نے مسٹر چوپڑا کے پژمردہ اور ویران آنکھوں کے آگے رنگ ونور بکھیر دیئے'' ۲؎

اور ایک جگہ غضنفر علی یوں رقم طراز ہیں:

''کیسی لگی سر؟''

''بہت اچھی۔ بہت ہی پیاری۔ ایک دم فنٹاسٹک!''

''تھینک یو سر!''

''مگر ملہوترا!''

''سر؟''

''گھر کے اندر جا کر کہیں یہ بھی ایر ہوسٹس کی طرح باسی اور پھیکی تو نہیں ہوجائے گی'' ۳؎

ان اقتباسات سے قاری کو یہ سمجھ میں آتا ہے کہ عورت کو سماج میں اس کے کام کو نہیں بلکہ اس کے حسن، خوبصورتی اور نزاکت کو ترجیح دی جاتی ہے۔ کوئی اس کے محنت پر شاباشی نہیں دیتا ہے بلکہ ہر کوئی اس اسے لطف ونروز ہونا چاہتا ہے کوئی اس کے دل میں جھانک کر اس کی پریشانیوں کو کم نہیں کرنا چاہتا ہے بلکہ صرف اپنی خواہشات کے پیچھے لگے رہتے ہیں۔

غضنفر کہتے ہیں کہ آج کے سماج میں عورت کے لیے جو سب سے بڑا مسئلہ پیش آتا ہے وہ ہے

کام کرنے کی جگہ۔عورت اپنی پوری محنت ولگن سے کام کرتی ہے پھر بھی اسے خوبصورتی کی وجہ سے دیکھا جاتا ہے۔عورت کوایک مشین سمجھتے ہیں۔اس کواس کی محنت کا عوض نہیں ملتا ہے۔ ہر کوئی تازہ تر دیکھنا پسند کرتا ہے۔اس طرح غضنفر نے افسانے میں ایک جگہ عورت کی نفسیات کو بتانے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح عورت اپنی ذمہ داری کو ہر مشکل میں رہنے کے باوجود بھی نبھاتی ہے۔وہ اندر سے کتنی ہی سوچ وفکر میں کیوں نہ ڈوبی ہوں دوسروں کوخوش دیکھنا چاہتی ہے۔افسانے کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''یہ کیا؟ آپ نے پھر چہرے کوتناؤ سے بھرلیا؟ میں کہتی ہوں آخر اتنی سوچ فکر کیوں؟ یہ بھاگ دوڑ کس لیے؟......زندگی مسکرانے کے لیے ملی ہے، اُداس ہونے کے لیے نہیں۔ میں اس چہرے پر پھول دیکھنا چاہتی ہوں، خارنہیں۔آیئے گرم پانی تیار ہے، منہ ہاتھ دھو لیجیے، کچھ ریلیف مل جائے گا۔'' [۴۲]

غضنفر کے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت صبر وآزمائش کی دیوی ہوتی ہے جو ہمیشہ خود سے زیادہ دوسروں کے جذبات واحساسات کا خیال رکھتی ہے وہ تمام حالات اور مشکلات سے جوجھتی ہے پھر بھی اپنے ذہن میں دوسروں کی ذمہ داریوں کا جذبہ رکھتی ہے۔اس کی زندگی میں تکلیف، پریشانی کیوں نہ آئیں وہ دوسروں کوزندگی جینے اور مسکرانے کی بات بتاتی ہے۔اس نے اپنے ذہن میں یہ سوچ لیا ہے کہ زندگی جینے کے لیے ملی ہے بظاہر افسوس کے اس کا سامنا کرنا چاہیے۔

یوں تو آفس اور دوسروں کے گھروں میں کام کرنا الگ الگ ہوتا ہے۔عورت کو ہر جگہ کام کرنے میں دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے طرح طرح کے مشکلات پیش آتی ہیں۔دوسروں کے گھروں میں کام کرنا کوئی آسان بات نہیں ہوتی ہے۔اس کے باوجود ایک عورت کام کے ساتھ ساتھ اس گھر

والوں کے چہرے پر ہمیشہ خوشی دیکھنا چاہتی ہے۔ ہر وقت اس کے ذہن میں یہی سوچ رہتی ہے کہ جہاں میں کام کرتی ہوں وہاں ہر کوئی خوش رہے۔ان کی زندگی میں کوئی پریشانی نہ آئے۔

اس افسانے میں غضنفر نے موجودہ دور کو محسوس کرتے ہوئے بتایا ہے کہ رفتہ رفتہ کس طرح سائنسی ترقیات اور انسانی مصروفیات نے انسانی رشتے خلوص ومحبت اور گھر کے خوشگوار ماحول کو اثر میں لے لیا ہے۔انسانی جذبات واحساسات اس بھاگ دوڑ کی زندگی میں اپنی معصومیت کھو چکے ہیں۔اپنے وجود کو بھول چکے ہیں۔ ہر چیز کو تجارتی انداز سے تولتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ہمارا سماج انسانی وجود کو ایک دلکش کھلونے کی مانند دیکھنے کے قائل ہو چکا ہے۔

جس طرح بچے کھلونوں کو دیکھ کر خوش ہو جاتے ہیں اسی طرح عورتوں کے تئیں ہمارا سماج کا یہ نظریہ بن چکا ہے کہ وہ بھی اپنی دکھ درد کو بھول کر اپنی محبت اور ممتا سے ہر ایک کے دکھوں کو خوشیوں میں بدل سکیں۔اس کا جائزہ ہم ''ہاؤس ہوسٹس'' کا آوٹ گیلری میں نمائش لگانے کے بعد سماج کے ہر شعبے کے متعلق افراد کی رائے سے لگا سکتے ہیں۔ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''آپ کی فیکٹری نے یہ ایک ایسا جاندار کھلونا بنایا ہے جو بے جان جسموں میں بھی جان ڈال دیتا ہے اور جو بچہ، بوڑھا، جوان، مرد، عورت سب کے لیے کشش رکھتا ہے۔ (رپورٹر)
>
> ''اس تخلیق کو دیکھ کر میری طرح بہت سے ادیب تخلیق کرنا بھول جائیں گے''
>
> (ادیب)
>
> ''آپ اسے بیچنا چاہیں تو میں اس کے منہ مانگے دام دے سکتا ہوں''
>
> (تاجر)

''آپ اسے میرے گھر پہنچا دیجیے۔ بدلے میں جو چاہے کرا لیجیے'' (منسٹر)

''مجھے یہ اتنی اچھی لگی کہ میں اپنے ممی پاپا کو بھی بھول گئی'' (طالبہ) ۵؎

آزادی سے قبل عورتوں کی کسمپرسی یہ تھی کہ انھیں ایک داسی سے زیادہ کی حیثیت حاصل نہ تھی۔ لیکن وہ کسمپرسی آج بھی برقرار ہے۔ آج زمانہ ترقی کی بلندیوں پر ہے لیکن عورتوں کے تعلق سے لوگوں کے جو نظریات ہیں وہ جمود کا شکار کل بھی تھے اور آج بھی ہیں۔

غضنفر اس پورے افسانے میں یہ بتاتے ہیں کہ ایر کنڈیشن آفس میں ہوتے ہوئے بھی مسٹر چوپڑا کا تناؤ اور دباؤ گھر کا بگڑا ہوا توازن ہاؤس ہوسٹس کی نمائش اور رجسٹر پر لیے گئے پان پٹیو کمنٹس ایسے اشارے ہیں جن سے کہانی کی شکل بنی ہے۔

غضنفر کے فکشن کے موضوعات پر توجہ دیں تو کبھی کبھی حیرت ہوگی کہ وہ اپنے عہد کے ان تمام مسائل سے واقف نظر آتے ہیں جو ان کے عہد میں رونما ہو رہے ہیں۔ اسی مسائل پر ان کا افسانہ ''خالد کا ختنہ'' سرفہرست ہے۔ جو ان کے افسانوی مجموعے ''حیرت فروش'' میں شامل ہے۔ یہ افسانہ اردو اور ہندی کے کئی رسائل کی زینت بنا اور سراہا گیا ہے۔ اگر ادب کو زندگی کی ہمہ گیر ترجمانی کہتے ہیں تو یہ تقاضا بھی فرض ہے کہ زندگی کی اہم اور غیر اہم صورت حال لکھنے والے کے پیش نظر ہو۔ سعادت حسن منٹو جیسے افسانہ نگار کے ذہن میں بھی یہ موضوع نہیں آ سکا۔ طوائفوں کے کوٹھوں تک تو ترقی پسند افسانہ نگار پہنچے اور وہاں انسانی چہرے تلاش کرنے میں کامیاب رہے لیکن ''ختنے'' کی محفل تک آنے میں ان کا اشرافیہ مزاج رکاوٹ بن گیا۔

غضنفر کے اس افسانے کا ماحول کسی افلاس زدہ یا بھوکے ننگے کے گھر کا نہیں ہے۔ بلکہ ایک بچے اور ماں کے جذبات کو دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ کس طرح جب بچہ روتا ہے تو ماں کیسی تکلیف سے

گزرتی ہے۔ایک معصوم بچے کے ذہن میں بیٹھے ہوئے اس خوف کی کہانی جس میں پورے ملک کی اقلیت اوراب اقلیت کی نئی نسل بھی متاثر ہے۔

اس افسانے کا مرکزی کردار خالد اوراس کی ماں ہے اورضمنی کردار میں اس کا باپ، پاکستان والے خالوخالہ اورعرب والے ماموں ممانی وغیرہ شامل ہیں۔

قصہ یہ ہے کہ خالد کا ختنہ ہورہا ہے سارا گھر روشنی سے سجا ہوا ہے۔ ہرطرح کے پکوان بن رہے ہیں سارا گھر مہمانوں سے بھرا ہوا ہے ہرطرف چہل پہل ہے۔ پڑوس کے مرد عورت جمع ہوئے ہیں ہر طرف خوشی کی لہر دوڑ رہی ہے۔خالد کے والد اور والدہ بہت خوش ہیں۔سارے مہمان خالد کے ختنہ کے لیے آ گئے ہیں۔خالد کو پکارا جارہا ہے بچوں سے پوچھا جارہا ہے مگر خالد کہیں نظر نہیں آتا ہے۔ ہر کوئی پریشان ہورہا ہے۔آخر خالد کباڑ روم میں چھپ کر بیٹھا ہوتا ہے۔ بلانے پر وہ آنے کو تیار نہیں ہوتا ہے۔ ماں آخر بیٹے سے پوچھتی ہے کیوں نہیں ختنہ کروانہ چاہتے ہو۔خالد ماں کو دیکھ کر زور زور سے رونے لگتا ہے۔ ماں بھی بیٹے کو روتا ہوا دیکھ کر رودیتی ہے۔تب پیار سے پوچھنے پر خالد کہتا ہے کہ ابو بولتے ہیں کہ جن کا ختنہ ہوتا ہے بدماش اسے مارڈالتے ہیں۔سب چپ ہوجاتے ہیں آخر میں پاکستان والے خالو خالد سے کہتے ہیں اگر ختنہ نہ کروتو ختنہ والے بدماش مارڈالیں گے۔تب خالد ختنہ کے لیے مان جاتا ہے اورختنہ ہوجاتا ہے۔

غضنفر اس افسانے میں بچوں کے آنسوں اور ماں کی تڑپ کو بتاتے ہیں ایک عورت جو دنیا کے تمام مسائل کا سامنا کرلیتی ہے مگر اپنے بچوں کو روتا نہیں دیکھ سکتی۔بچوں کی خوشی عورت کے لیے دنیا کی ہر نعمت سے بڑھ کر ہوتی ہے۔ایک بچے کو اس کی ماں سے بہتر کوئی نہیں جان سکتا ہے ہر ماں اپنے بچوں کو ہنستا ہوا دیکھنا چاہتی ہے۔ جب خالد روتا ہے ماں کا دل دہل جاتا ہے۔خالد بھی جو بات وہ کسی سے نہیں

کہتا ہے اپنی ماں سے کہہ دیتا ہے افسانے کا ایک اقتباس ملاحظہ ہوں:

''امّی ! امّی ! میں ختنہ نہیں کروں گا اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے''

''اچھی بات ہے۔ نہ کرنا لیکن یہ نیا کرتا تو پہن لو۔ دیکھو نا سارے بچے نئے نئے کپڑے پہنے ہوئے ہیں اور یہ دیکھو! یہ سہرا کتنا اچھا ہے تمہارے سر پر بہت سجے گا۔ لو، اسے باندھ کر دولہا بن جاؤ۔ یہ سب لوگ تمھیں دولہا بنانے آئے ہیں تمہاری شادی بھی تو ہوگی نا!'' [۶]

اس قتباس سے پتہ چلتا ہے کہ ایک ماں اچھے سے جانتی ہے کہ اس کی اولاد کس طرح خوش ہوسکتی ہے کیسے اسے بہلایا جاسکتا ہے۔ اس کی من کی بات کو وہی جان سکتی ہے جو صرف ایک ماں ہی کرسکتی ہے۔ جب خالد روتا ہے اسے کبھی نئے نئے کپڑے پہنے کو بولتی ہے کبھی سہرا کبھی دولہا بننے کی بات کرتی ہے کبھی شادی کی۔ ہر ممکن سے ممکن کوشش کرتی ہے اسے خوش دیکھنے کی۔

غضنفر کہتے ہیں کہ عورت صرف عورت ہو تو وہ بہت کچھ برداشت کرسکتی ہے مگر جب وہ ماں بنتی ہے اس میں ایک الگ سا جذبہ بیدار ہوتا ہے اس کے اندر ممتا جاگ اٹھتی ہے۔ ایک ماں سب برداشت کرسکتی ہے مگر اپنے بچوں کو روتا ہوا بلبلاتا ہوا نہیں دیکھ سکتی تو وہ برداشت نہیں کرسکتی ہے پھر وہ مارنے والا وہ بچے کا باپ ہی کیوں نہ ہوں۔ ماں ہمیشہ اپنے بچوں کو محبت وشفقت کی نظر سے دیکھتی ہے اور چاہتی بھی ہے کہ سب اس کے بچوں کو اسی نظر سے دکھیں۔ جب خالد کو اس کے والد زبردستی کرتے ہیں اور وہ زور زور سے رونے لگتا ہے تو اس کی ماں تڑپ اٹھتی ہے اس کی ممتا جوش کھاتی ہے۔ بچے کو روتا ہوا دیکھ کر ماں کا دل بے چین ہوجاتا ہے اس کے پاس آجاتی ہے اور خود بھی رونے لگتی ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''جھنجھلا کر ابو زبردستی پر اُتر آئے۔ خالد کی پینٹ کھول کر نیچے کھسکانے لگے

مگر خالد نے کھلی ہوئی پینٹ کے سروں کو دونوں ہاتھوں سے کس کر پکڑ لیا۔ آنکھوں سے آنسوؤں کے ساتھ لبوں سے رونے کی آوازیں بھی نکلنے لگیں۔ خالد کے آنسوؤں نے امی کی آنکھوں کو گیلا کر دیا۔ ''مت رؤو میرے لال! مت رؤو! تم نہیں چاہتے تو ہم زبردستی نہیں کریں گے تمہارا ختنہ نہیں کرائیں گے'' امی نے روندھی ہوئی آواز میں خالد کو دلاسا دیا اور اپنے آنچل میں اس کے آنسو جذب کر لیے۔ کچھ دیر تک امی خاموش رہیں پھر خالد کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں۔ ''پچھلے سال تو پھوپھی کے گھر کامران کے ختنے کے وقت تم خود ضد کرتے رہے کہ امی آپ میرا بھی ختنہ کرا دیجیے مگر آج تمھیں کیا ہو گیا ہے؟ تم اتنے ڈرپوک کیوں بن گئے؟ تم تو بڑے بہادر بچے ہو۔ تم نے اپنے زخم کا آپریشن بھی ہنستے ہنستے کرا لیا تھا۔ اس میں تو زیادہ تکلیف بھی نہیں ہوتی۔'' ؎

اس اقتباس سے غضنفر نے ایک ماں کی اندرونی کیفیت و جذبات کو سامنے لائے ہیں۔ جو ہر ماں میں اپنے بچوں کے لیے پایا جاتا ہے۔ ماں اپنے بچوں سے اتنی محبت کرتی ہے کہ جب خالد کو روتا ہوا دیکھتی ہے تو اس کے بھی آنکھوں میں آنسوں کے پیمانے چھلکنے لگتے ہیں۔ اس کی اندر کی ممتا جاگ اٹھتی ہے۔ اپنے آنچل سے آنسوں کو پونچھ لیتی ہے۔

غضنفر کہتے ہیں کہ کس طرح ماں اپنے بیٹے کو محبت بھری آواز سے تسلی دیتی ہے کہ جو تم چاہو وہی ہوگا۔ اس کی محبت کی ہر حد پار کر جاتی ہے وہ سب کچھ بھول جاتی ہے اس کے بچے کی آنسوں ہر درد سے بڑھ کر اسے محسوس ہوتا ہے اپنے جذبات بے قابو رکھ نہیں پاتی ہے۔ خالد کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے

کہتی ہے تم تو میرے بہادر بچے ہو۔ ماں کی نظر میں اس کی اولاد سب سے اچھی ہوتی ہے۔ ایک ماں ہی اپنے بچے کی من کی بات جان سکتی ہے یہاں بھی وہ خالد کے ڈر کو بہت پیار سے سمجھا کر باہر نکالتی ہے۔

غضنفر کا اور ایک افسانہ ''آٹے کی دلدل'' ہے جو ان کے افسانوی مجموعہ ''حیرت فروش'' میں شامل ہے۔ یوں تو غضنفر کے ہر ایک افسانہ میں ایک لطف ہوتا ہے مگر اس افسانے میں انھوں نے ہمارے سماج پر ہونے والے گھر کے مسائل کو موضوع بنایا ہے۔ غضنفر کے فن اور اسلوب کی یہ خوبی تو ہے ہی کہ وہ سماجی مسائل کو طرح طرح سے پیش کرتے ہیں بعض میں اساطیری اور کلاسیکی اسلوب کا عنصر پایا جاتا ہے۔ لیکن طوالت سے گریز کرتے ہوئے اپنے اسلوب کو ٹکڑوں ٹکڑوں میں پیش کر کے معنی کا ایک ایسا نظام تشکیل کرتے ہیں جس سے ایک لمحہ اور ایک جملہ بھی ادھر ادھر نہ ہونے پاتا ہے اور نہ ہی قاری کا ذہن غیر ضروری حوالوں، مکالموں کے ذریعہ وحدت تاثر یا مرکزی خیال سے ہٹنے نہ پائے۔

اس افسانے میں انھوں نے دیہی اور شہری زندگی کو پیش کیا ہے۔ کس طرح ایک عورت کو اپنے گھر پر سسرال میں مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اپنے اندرونی جذبات کو مار کر جینا پڑتا ہے۔ اپنے شوہر اور سسرال والے اسے کس نظر سے دیکھتے ہیں بیان کیا گیا ہے۔ آج کے ہمارے سماج میں ہر مرد اپنی بیوی کے علاوہ دوسروں کو دیکھنا پسند کرتے ہیں انھیں دوسروں کی بیوی اپنے سے زیادہ خوبصورت نظر آتی ہے۔ غضنفر نے اسے اپنے افسانے کا موضوع بنایا ہے۔

غضنفر نے اس افسانے میں ایک عورت پر ہونے والے اندرونی ظلم وستم کو پیش کیا ہے۔ اس میں ایک گھر پر رہنے والے شوہر بیوی چھوٹے بھائی اور اس کی بیوی، ساس وسسر کی کہانی بیان کی گئی ہے کہ کس طرح ایک گھر پر رہنے والی عورت کی ازدواجی زندگی ہوتی ہے۔ جب ایک لڑکی شادی ہونے کے بعد اپنے سسرال جاتی ہے تو شوہر کی خوشنودی اور اس کے گھر کی دیکھ بھال کے لیے سب کچھ قربان کرنے

کے لیے تیار ہو جاتی ہے۔

غضنفر کہتے ہیں کہ ہر عورت کو بچے کی خواہش ہوتی ہے جو ہر عورت کی زندگی میں بہت اہمیت رکھتی ہے۔ وہ عورت بھی اپنے زندگی میں بچے کے پیار کو محسوس کرنا چاہتی ہے جو اس کی زندگی کی سب سے بڑی خوشی ہوتی ہے۔ جب اس کا شوہر اسے یہ خوشی سے محروم کر دیتا ہے تو وہ اندرونی سوچ میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ اس کے جذبے ٹوٹنے لگتے ہیں۔ افسانے کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''بیوی اس سے اپنی کوکھ میں بچہ چاہتی مگر وہ اسے جھلّی میں ڈال دیتا جھلّی کو لے کر ہر بار ان کے درمیان کھینچا تانی ہوتی اور اس کھینچا تانی میں اکثر ان کے جذبوں کی نسیں ٹوٹ جاتیں۔ جذبوں کی نسیں جب ٹوٹتیں تو جسم کا ریشہ ریشہ بکھر جاتا'' ؎۸

اس اقتباس سے ہمیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ جب کوئی اپنے اندر خوشی کی خواہش کو مار دیتا ہے تو اس میں جینے کی آس بہت کم ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے حالات سے لڑنے کے لیے اپنے آپ کو دوسرے کے مقابلہ میں خود کو کم سمجھنے لگتی ہے۔ وہ اپنے وجود کو بھول کر ایک زندہ لاش کی طرح رہ جاتی ہے۔ جو زندہ تو رہتی ہے مگر اس میں احساس مر جاتا ہے۔ اس حالات پر نہ تو وہ خود خوش رہتی ہے نہ تو کسی سے باتیں کر سکتی ہے نہ ہی وہ خود کو کبھی آئینہ میں دیکھتی ہے۔ وہ بھول جاتی ہے کہ وہ ایک عورت ہے۔ اسے ہمیشہ سج سنور کر رہنا چاہیے مگر جب انسان کی خواہش ٹوٹتی ہے وہ اندرونی مسائل سے جوجھتا رہتا ہے۔ ایسے میں وہ اپنے آپ کو دیکھ نہیں پاتی ہے جس کی وجہ سے اس کا اپنا شوہر اس کو ناپسند کرنے لگتا ہے۔ ایسے دوسروں کی بیوی اپنی عورت سے زیادہ خوبصورت معلوم ہونے لگتی ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''معمولی ناک نقشہ اور اوسط درجے کے جسم کے باوجود چھوٹے بھائی کی

بیوی چست درست لگتی اور گھر آنے جانے والوں کو attract کیا کرتی
جبکہ اس کی بیوی تیکھے نقوش اور بھرے پُرے بدن کے باوجود کڑک مرغی
سی دکھائی دیتی۔ اس کا کڑک پن کٹ کھنی مرغی کی طرح جھپٹ جھپٹ کر
اسے ٹھونگیں مارتا اور اس کے احساس کو نوچ کھسوٹ ڈالتا'' 9

اس اقتباس سے پتہ چلتا ہے کہ جسمانی لحاظ سے چھوٹے بھائی کی بیوی اچھی نہ ہونے کے باوجود پھر بھی اچھی لگتی تھی۔ اس کی بیوی ناک ،نقشہ یہاں تک کہ پوری طرح خوبصورت تھی پھر بھی چھوٹے بھائی کی بیوی سے گھر پر سب پیار کرتے ہیں اس کی بیوی سے چھوٹے بھائی کی بیوی کو گھر میں آنے جانے والے مہمان سے لے کر گھر کے سب افراد زیادہ پسند کرتے تھے۔ یہاں تک کہ اس کا شوہر خود اسے ناپسند کرتا تھا۔

غضنفر کہتے ہیں کہ آج کے ہمارے سماج میں ایک عورت کو اس کے گھر میں ایک دوسرے سے مقابلہ کیا جاتا ہے۔ جہاں ایک کو پیار و محبت ملتی ہے وہیں دوسروں کو حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ اس افسانے میں سب جہاں چھوٹے بھائی کی بیوی کو زیادہ پسند کرتے ہیں ہر کوئی اسے سر آنکھوں میں بیٹھاتا ہے وہیں بڑی بیوی کو یہ پیار و محبت سے محروم رہتی ہے۔ وہ اندر ہی اندر ٹوٹتی بکھرتی جاتی ہے۔ ہر کوئی چھوٹی بیوی کو بے ضرورت باتیں کرنا اپنے پاس بلانا پسند کرتے ہیں کیوں کہ جو خوشی انھیں چھوٹی بیوی دیتی ہے وہ بڑی بیوی نہیں دے پاتی۔ افسانے کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''اس کی بیوی گھر کی بڑی بہو تھی مگر ابا ہمیشہ چھوٹی بہو کو مخاطب کرتے۔ ابّا
کے پکارنے پر جب چھوٹی بہو کے منہ سے ''جی ابا جان'' نکلتا تو لگتا جیسے کسی
کسے ہوئے ساز سے جھنکار نکیل ہو۔ اس وقت چھوٹی بہو کا چہرہ بھاری بھرکم

باؤوں سے بھر جاتا۔اس کی چال ڈھال میں لوچ سا پیدا ہو جاتا اور وہ کسی
دربا کی تجربہ کار رقاصہ نظر آنے لگتی۔اس کی نگاہیں اس کے سراپے میں
کھو جاتیں۔وہ اپنی بیوی کو بھی اسی شکل میں دیکھنا چاہتا اس کے سراپے میں
بھی رقص کا عکس ملاحظہ کرنا چاہتا۔یقیناً اس کی بیوی بھی چاہتی ہوگی کہ اس
کے ساز کا بھی تار کسے،اس کے لب سے بھی جھنکار نکلے اس کے رُخ پر بھی
بھاؤ سجے اس کی چال ڈھال میں بھی لوچ پیدا ہو۔ممکن ہے وہ اپنے سسر کو
کوستی ہو مگر اس میں ان کا بھی کیا قصور۔پکارا تو اسی کو جاتا ہے نا جو پکار کا
جواب دیتا ہے اور جواب وہ دیتا ہے جس کے پاس جواب ہوتا ہے۔
اپنے پاس جواب نہ ہونے کا ذمے دار وہ اسے ٹھہراتی ہوگی کیوں کہ جب
جب چھوٹی بہو کے منہ سے جھنکار نکلتی اس کی بیوی کی آنکھیں سوال بن کر
اسے گھورنے لگتیں اور سوالوں کی سوئیاں بچھو کے ڈنک کی طرح اس میں
ٹوٹ جاتیں'' [10]

اس سے پتہ چلتا ہے کہ بڑی بہو کی سسرال میں جو بے عزتی ہوتی ہے اس کا ذمہ دار وہ نہیں بلکہ اس کا شوہر ہے۔پھر بھی وہ برداشت کرتی چلی جارہی ہے۔وہ بڑی ہونے کے باوجود اس کے ساتھ کوئی محبت کے دو بول بولنے کو تیار نہیں ہے۔سب سے چھوٹی بہو کو پکارتے ہیں اس سے پیار کرتے ہیں۔کبھی کبھی اس کا شوہر بھی اسے چھوٹی بہو کی شکل میں دیکھنا چاہتا ہے۔وہ چاہتا ہے کہ اس کی بیوی کو بھی سب پیار کی نظر سے دیکھیں اس کی بھی عزت ہو وہ بھی اپنے اندر کے درد کو بھول جائیں اور وہ خود کبھی کبھی یہ سوچتی ہے کہ مجھے بھی کوئی پیار کے دو بول بول دیتے۔میری بھی اپنے سسرال میں عزت ہو مگر یہ سب ممکن

نہیں تھا۔

ہمارے سماج میں عورت کو گھر پر عزت اس وقت ملتی ہے جب وہ پوری ہوں۔ پوری سے مراد اس سے بچے ہوں۔مگر بچے پیدا کبھی ایک عورت خودنہیں کرسکتی ہے پھر بھی بچے نہ ہونے کا ذمہ دار گھر والے عورت کو ہی مانتے ہیں گھر پر بڑی بہو کوان سب مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وہ اندر ہی اندر اپنے جذبات کو مارتی ہے۔ جب سب چھوٹی بہو کو عزت سے پکارتے اسے پیار کرتے اس وقت بڑی بہو صبر و تحمل کے ساتھ اپنے درد وغم کو جھیلتی نظر آتی ہے۔ان سب کی وجہ یہ ہے کہ اس کو کوئی بچہ نہیں ہے جس کی ذمہ دار وہ خودنہیں بلکہ اس کا شوہر ہے۔اس کے باوجود وہ سب کچھ برداشت کرتی ہے۔

اس افسانے کے مطالعہ سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ غضنفر نے ایک ایسی عورت کی تصویر کشی کی ہے جسے اس کا شوہر کسب معاش کے لیے استعمال کررہا ہے اور وہ اپنے شوہر کو خوشنودی کے لیے کام کرنے پر مجبور ہے لیکن اس کے اندر کے جذبات واحساسات اسے ہمیشہ لعنت ملامت کرتے رہتے ہیں۔ وہ ایک ایسی جیل میں بند ہے جہاں سے نکلنے کے تمام راستے بند ہیں وہ تڑپتی ہے روتی ہے لیکن اس قید سے نکل نہیں پاتی ہے۔

غضنفر کے افسانوں کے مطالعہ کے بعد یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے عورتوں سے متعلق نہ صرف مختلف مسائلوں کو اپنے افسانوں میں پیش کیا بلکہ سماج میں پلے ہوئے ان جرائم سے بھی قاری کو باخبر کیا کہ عورتیں اپنی آزادی کے باوجود مردوں کے پھندے میں جکڑی ہوئی ہیں۔ان کے مسائل ختم نہیں بلکہ ان کا استحصال آج بھی جاری ہے۔

غضنفر کا اور ایک مشہور افسانہ ''ملبے پر کھڑی عمارت'' جوانکے افسانوی مجموعے ''حیرت فروش'' میں شامل ہے۔اس میں معصوم طالب علم بچوں کو بوجھل کردینے والے گھر کا مسئلہ زیر بحث ہے۔گھر کے

ماحول میں بھی بچہ اس لعنت سے بری نہیں ہو پاتا۔ جہاں بچے کی سچائی پر یقین نہیں کیا جاتا اور اسے شک و شبہ کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔

غضنفر نے افسانے میں دو طرح کے مسائل کی طرف اشارہ کیا ہے۔ پہلے یہ کہ عورت کا تعلیم یافتہ ہونا بے حد ضروری ہے۔ کیوں کہ ایک عورت کے ذمے ایک گھر کا پورا خاندان ہوتا ہے۔ اگر ایک عورت تعلیم یافتہ ہوں گی تو اپنے اولاد کی پڑھائی لکھائی میں اس کی مدد کرے گی۔ اس کی پرورش اچھی طرح سے کرے گی۔ دوسرے یہ ہے کہ اگر گھر پر بچہ نہ پڑھے یا بگڑ جائے تو اس کا ذمہ دار عورت کو مانا جاتا ہے جب کہ اولاد کی پرورش و تربیت میں ماں باپ دونوں کی ذمہ داری ہوتی ہے مگر اس افسانے میں اولاد کے نہ پڑھنے کا ذمہ دار صرف عورت کو ٹھہرایا جاتا ہے مرد کو نہیں۔

اس افسانے میں عورت کے اُن مسائل کو دیکھا گیا ہے جو ہمارے سماج اور اطراف و اکناف کے ماحول میں روز مرہ زندگی میں ایسے واقعات ہمیشہ پیش آتے رہتے ہیں۔ جب کوئی عورت کم پڑھی لکھی ہوتی ہے تو اس کا اثر اس کے شوہر کے ساتھ ساتھ بچوں پر بھی پڑتا ہے۔ اسے اپنی زندگی میں طرح طرح کے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

اس افسانے کا مرکزی کردار باپ، ماں اور بیٹا ہے۔ کہانی یہ ہے کہ بیٹا جو چھٹی کلاس میں کم نمبرات حاصل کرتا ہے۔ جس کی وجہ سے باپ اسے بہت مارتا ہے پڑوسی کے روکنے سے چھوڑتا ہے۔ مگر اس کا غصہ برقرار رہتا ہے۔ بچے کو پوچھنے پر وہ بتاتا ہے کہ میں محنت کرتا ہوں اس کے باوجود بھی میرے نمبر کم آئے اگر یقین نہ آئے تو میری ماں سے پوچھ لو۔ باپ ماں کو بھی کوئی اس کے کم نمبر رکھنے کا ذمہ دار ٹھہراتا ہے۔ افسانے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''اللہ قسم میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں آپ ممی سے پوچھ لیجیے''

''ممی سے کیا خاک پوچھیں؟ یہ دھیان رکھتی تو آج یہ تیری درگت نہیں بنتی''

[11]

اس اقتباس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آج کے موجودہ دور میں ہر کام کا ذمہ دار عورت کو مانا جاتا ہے۔ایک عورت پورے گھر کی ذمہ داری اپنے سر لینے کے باوجود اس پر الزام لگایا جاتا ہے۔ یہ ہر گھر کی کہانی ہوگئی ہے کہ جب بچہ اچھا کام کرتا ہے تو اس کا سہرا باپ پر جاتا ہے وہی بچہ اگر کچھ غلط کرتا ہے ہے یا پڑھائی میں کم نمبر لاتا ہے تو اس کا ذمہ دار ماں کو ٹھہرایا جاتا ہے۔ دیکھا جائے تو بچہ اگر نا کام ہوتا ہے تو سب سے زیادہ تکلیف ماں کو ہوتی ہے مگر وہ اپنی دلی کیفیات سب کے سامنے ظاہر نہیں کرسکتی ہے۔ پھر بھی وہ سب کچھ چپ چاپ سہتی ہے۔

ایک عورت کی زندگی میں تعلیم حاصل کرنا بہت ضروری ہوتا ہے۔ سماج اور گھر کو خوش حال بنانے کے لیے علم حاصل کرنا ہوتا ہے۔افسانے میں ماں اپنے اولاد کے لیے ہر طرح سے کوشش کرنے کے باوجود بچہ کم نمبر لاتا ہے جس کا ذمہ دار باپ اسے نہیں مانتا ہے۔اس افسانے کا اقتباس ملاحظہ ہو:

''کمال ہے تم دھیان دیتی ہو یہ محنت سے پڑھتا ہے رزلٹ پھر بھی تھرڈ کلاس میں پوچھتا ہوں پھر یہ نمبر اتنے کم کیوں آئے؟'' آخری جملے کی آواز چیخ میں بدل گئی۔شعلہ بار آنکھیں بچے کے چہرے سے نکل کر بیوی کی طرف لپک پڑیں۔

''میں کیا جانوں؟''

''تو کون جانے گا؟ اس کے ساتھ تم بھی جھوٹ بول رہی ہو۔ یہ سب تمہاری ہی لا پرواہی کا نتیجہ ہے تم ہی اسے بگاڑ رہی ہو'' آنکھوں سے شعلے بھڑکنے

لگے۔'' ۱۲؎

اس اقتباس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ بچے کی پرورش کی ذمہ داری جوکہ ماں باپ دونوں پر ہوتی ہے۔اس کے باوجود اگر بچہ بگڑ جائے تو باپ اس کی ماں کو ہی ذمہ دار قرار دیتا ہے۔ ہر ماں کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کا بچہ پڑھ لکھ کر آگے بڑھے۔ بڑا اعلیٰ مقام حاصل کرے۔اس کے لیے وہ ہر ممکنہ کوشش کرتی ہے۔لیکن اس کے باوجود اگر ذرا بھی کوتاہی ہو جائے تو باپ اس کی ماں کو ذمہ دار ٹھہراتا ہے۔ بچے کی غلطی کو نہیں دیکھتا ماں جو بچے کی پرورش کے لیے ہزاروں جتن کرتی ہے۔اگر کوئی ایک غلطی بچے سے سرزد ہو جائے تو اس کا ذمہ دار ماں کو بتایا جاتا ہے۔لیکن کوئی ماں یہ نہیں چاہتی کہ اس کا بچہ بگڑے یا اس کا مستقبل خراب ہو۔والد کی بھی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ بچوں کی پرورش میں کوئی کوتاہی نہ کرے۔ کیوں کہ یہ ذمہ داری صرف ماں کی نہیں ہے۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ غضنفر زندگی کے اسرار ورموز کو تلاش کرنے والے افسانہ نگار ہیں۔ان کی نظر زندگی کے مختلف عوامل پر رہتی ہے۔ان کے افسانوں میں سچائیاں تہہ در تہہ کھلتی ہیں اور قاری کے ذہنوں پر آہستہ آہستہ ضرب لگاتی ہے۔اس آہستہ روا ثرات کے مرتب ہونے سے کہانی کی فضائیت دیر تک دل و دماغ کے گوشوں کو منور رکھتی ہے۔غضنفر نے عورتوں کی زندگی کے ان مسائل کو اپنے افسانوں میں بیان کیا ہے جو ہمارے سماج میں روز بہ روز برپا ہو رہے ہیں۔

افسانہ ''منگول بچہ'' غضنفر کا مشہور افسانہ ہے جو کہ ان کے افسانوی مجموعہ ''حیرت فروش'' میں شامل ہے۔اس افسانے میں غضنفر نے ایک ماں کی اپنے اولاد کے لیے فکرمندی کو پیش کیا ہے کہ کس طرح کوئی ایک بچہ ماں کے لیے اہمیت رکھتا ہے۔عورت کی سب سے بڑی خوشی اولاد ہوتی ہے اور اگر کوئی اولاد بیمار ہوں، بول نہیں پاتا ہو، سُن نہیں پاتا ہو تو ماں کے اندر جو تکلیف ہوتی ہے وہ صرف ایک ماں ہی

سمجھ سکتی ہے۔ ماں کے احساسات کو کوئی اور محسوس بھی نہیں کر سکتا۔

اس افسانے کا مرکزی کردار انوری ہے جو کہ ایک منگول بچے کی ماں ہے۔ منگول بچے سے مراد ایسا بچہ جس کے حواس کام نہیں کرتے ہیں۔ ایسا بچہ جو نہ بول پاتا ہے نہ سُن پاتا ہے اور نہ ہی ٹھیک سے دیکھ پاتا ہے۔ اس کے جسم میں جان تو ہوتی ہے مگر احساس نہیں ہوتا ہے۔ وہ زندہ لاش بن کر رہتا ہے۔ ایسے میں انوری کے اندر کے جذبات جو اپنے بچہ کو ٹھیک کرنے میں ابھرتے ہیں۔

اس افسانے کی ابتدا انوری اور اس کے بھائی کے مکالمہ سے شروع ہوتی ہے۔ اس افسانے میں غضنفر نے ایک ایسی ماں کی تصویر کشی کی ہے۔ جو رات دن اپنے بچے کے غم میں مبتلا رہتی ہے کہ کیسے اس کا بچہ ٹھیک ہو اس کے ذہن میں ہمیشہ یہ بات حاوی رہتی ہے۔ اور اس کی یہ فکر مندی نہ اسے سونے دیتی ہے نہ ہی خوشگوار زندگی گزارنے دیتی ہے۔ انوری کا بچہ دیکھنے میں تو ٹھیک ہے لیکن جسمانی طور پر وہ معذور ہوتا ہے۔ اسی بات کا درد و کرب انوری کو نہ چین سے جینے دیتا ہے۔ ہر ماں کی طرح وہ بھی چاہتی ہے کہ اس کا بچہ بولے، سنے، بات کرے۔ اولاد کی فکر میں وہ اندر ہی اندر ٹوٹتی جاتی ہے۔ اس کی اولاد کا غم اس کی زندگی کا سب سے اہم مسئلہ بن جاتا ہے۔

اس افسانے میں غضنفر نے انوری کی بے بسی کی تصویر کشی نہایت ہی دردمندانہ انداز میں کی ہے ساتھ ہی ساتھ عورت کی زندگی کا جو سب سے بڑا مسئلہ ہے جو عمر بھر اس کا سامنا کرنا پڑتا ہے اسے بھرپور انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ عام طور پر جب کسی کے گھر پر اولاد ہوتی ہے تو گھر والے بہت خوش ہوتے ہیں اور اسی خوشی میں مٹھائی سب کو تقسیم کرتے ہیں۔ انوری کو جب لڑکا پیدا ہوتا ہے تو سارے خاندان کے افراد خوشیاں مناتے ہیں۔ مٹھائیاں تقسیم کی جاتی ہے۔ نہایت ہی عمدہ طور سے جشن منایا جاتا ہے۔ ہر ایک رسم و رواج کی پابندی کی جاتی ہے۔ سب بہت خوش رہتے ہیں لیکن یہ خوشیاں

زیادہ دن تک نہیں رہ پاتی ہیں۔اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ انوری کو خدا نے جو اولاد دی ہے وہ ایک منگول بچہ ہے ان کی خوشیاں مایوسی میں بدل جاتی ہیں۔

ہر ماں کی طرح انوری کو بھی ہمیشہ اس بات کی فکر ہو جاتی ہے کہ کس طرح اس کا لڑکا صحت مند ہو اور دوسرے بچوں کی طرح زندگی گزارے۔اس کے لیے وہ انتھک محنت کرتی ہے۔جدوجہد کرتی ہے۔ایک جگہ سے دوسری جگہ لے کر جاتی ہے۔کس طرح اس کی اولاد ٹھیک ہو جائے۔محنت ومشقت کے ساتھ ساتھ پیسہ بھی خرچ کرتی ہے۔بدلے میں بس اتنا چاہتی ہے کہ اس کا بچہ ٹھیک ہو جائے۔افسانے کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''انوری تم نے کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھایا؟''

''انڈومان میں تو سارے ہی ڈاکٹروں نے دیکھا۔اپنے اپنے طریقے سے سب نے علاج کیا۔مگر آخر میں سب نے یہی کہا کہ میں اسے دہلی لے جاؤں''

''یہاں کے ڈاکٹر کیا کہتے ہیں؟''

''ابھی تو ایک کو دکھایا ہے۔دسیوں ٹیسٹ ہو چکے ہیں۔کچھ اور ٹیسٹ باقی ہیں۔ٹیسٹ مکمل ہو جانے کے بعد ہی وہ کچھ کہہ پائے گا۔''

''کم بخت یہ نگوڑے ڈاکٹر بھی خوب ہیں۔ٹیسٹ پر ٹیسٹ کرائے جاتے ہیں پیسے کو تو جیسے کچھ سمجھتے ہی نہیں۔''

''بھیّا! ہمیں پیسوں کی فکر نہیں ہے۔مجھے تو اب اس کی بھی فکر نہیں کہ یہ پوری طرح ٹھیک ہو جائے،میں تو بس یہ چاہتی ہوں کہ کسی طرح اتنا ہو جائے کہ

یہ مجھے پہچان سکے ۔ یہ جان سکے کہ میں اس کی ماں ہوں ۔ ماں جس
نے......''

''انوری کی آوازلرز کرٹوٹ گئی۔تھمے ہوئے آنسو پھر جاری ہو گئے'' ۱۳؎

اس اقتباس کے مطالعہ سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ انوری کس درد سے گزر رہی ہے۔ ہرعورت کی طرح وہ بھی اپنے بچے کو تندرست دیکھنا چاہتی ہے۔ نہ اسے اپنی فکر ہوتی ہے اور نہ ہی پیسہ کی بس اسے اولاد کی فکر ستاتی ہے۔اس کا درد ساری حدوں کو پار کر جاتا ہے۔اس کی خواہش اب نہیں ہوتی ہے کہ اس کا بچہ پوری طرح ٹھیک ہو بلکہ بس اتنا ہو جائے کہ ماں کہہ کر بلائے۔اس وقت انوری کی سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ اس کا بچہ کب اسے پہچانے کہ اس کی ماں یہ ہے۔اسی کوشش میں کوئی بھی کسر باقی نہیں رکھتی۔

غضنفر نے یہاں ایک عورت کو مرد کے روپ میں پیش کیا ہے کہ کس طرح وہ وقت پڑنے پر ہر مشکل کا سامنا کرتی ہے۔اور اپنی اولاد کے لیے ایک ڈھال بن کر کھڑی ہوتی ہے وہ اپنی زندگی میں آنے والے مسائل کا ڈٹ کر مقابلہ کرتی ہے۔لیکن اندر ہی اندر اس کا غم اس کو کھائے جاتا ہے۔آخر وہ ایک ماں جو ہے۔ایسے میں ایسی ماں جو ہر مصیبت اور مشکل کا سامنا کرنے کے لیے تیار رہتی ہے۔ بدلے میں بس یہی چاہتی ہے کہ اس کا بچہ ٹھیک ہو جائے صحت مند ہو جائے۔

جیسا کہ اس افسانے میں غضنفر نے ایک جملے میں ماں کے درد وکرب کو دکھایا ہے۔جب انوری کا بھائی یہ کہتا ہے:

''سب سے بڑا دکھ تو یہی ہے کہ یہ کسی کو پہچانتا ہی نہیں یہاں تک کہ اپنی جنم
دینے والی کو بھی نہیں انوری کا گلا رُندھ گیا۔آنکھیں ڈبڈبا آئیں'' ۱۴؎

اس سے پتہ چلتا ہے کہ انوری کے اندر بہت درد بھرا ہے۔ وہ اپنے بچے کو لے کر اتنا فکر مند ہے کہ ذرا ذرا سی بات پر غمگین ہو جاتی ہے۔ جس کا درد صرف ایک عورت ہی محسوس کر سکتی ہے۔ انوری اپنے بچے کے لیے سب کچھ کرتی ہے۔ جو ایک ماں کے لیے ممکن ہوتا ہے پھر بھی وہ مایوس ہے۔ اس کی آنکھیں نم ہے۔ آواز میں درد ہے اس نے اس بچے کے لیے ہر طرح کی مشکلات برداشت کی ہے۔ اس افسانے کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''روئے نہیں تو کیا کرے بے چاری! تم نہیں جانتے کہ کتنی مشکلوں سے اس گھر کا چراغ روشن ہوا تھا۔ اولاد کے لیے ان بے چاروں نے کیا نہیں کیا؟ طرح طرح کا علاج، دعا، تعویذ، جھاڑ پھونک، ٹونا ٹوٹکے، نذر نیاز، درگاہوں پر حاضری، مزاروں پر چادریں۔ تب کہیں جا کر اس کا نصیب جاگا۔ بچے کی ولادت پر انھوں نے خوشیاں بھی دل کھول کر منائیں۔ ایک ایک گھر میں مٹھائیاں تقسیم کیں۔ سارا محلّہ چراغوں سے روشن کر دیا۔ جشن پر ہزاروں روپئے لٹا دیے مگر اس کرم جلی کو کیا پتہ تھا کہ جس کے لیے اس نے خواب دیکھے۔ آرزوئیں پالیں۔ منتیں مانیں، درد سہا، تکلیفیں اٹھائیں، خزانے لٹائے، وہ ایک دن منگول ثابت ہوگا۔'' [۱۵]

اس اقتباس کے ذریعہ یہ بات واضح ہوتی ہے کہ کس طرح والدین اپنے اولاد کے لیے طرح طرح کے جتن کرتے ہیں۔ ہر وہ جگہ جاتے ہیں جہاں انھیں اپنی اولاد ٹھیک ہونے کی امید ہوتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود جب ان امیدوں پر پانی پھر جاتا ہے تو وہ کس طرح بکھر جاتے ہیں اور خصوصاً ایک ماں بچپن سے لے کر بڑے ہونے تک اپنا خون جگر دے کر پالتی ہے اور ہمیشہ یہی دعا کرتی ہے کہ اس کی

اولاد ٹھیک ہو۔اور خوب ترقی کرے۔ جب وہ دنیا میں آتا ہے تو اس کے دل پر کیا گزرتی ہوگی یہ تو بس وہی جانتی ہے۔ درد و تکلیف برداشت کرنے کے بعد جب اسے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس کا بچہ یہ بھی نہیں جانتا کہ اس کی ماں کون ہے۔غضنفر نے انوری کے درد کی انتہا کو بیان کیا ہے۔عورت بھلے ہی اپنے جذبات کی عکاسی نہ کرتی ہو۔لیکن اندر ہی اندر وہ ٹوٹ جاتی ہے چاہے وہ زندگی کا کوئی بھی مسئلہ کیوں نہ ہو۔

افسانہ ''جنگل''، غضنفر کا ایک بہت ہی مشہور افسانہ ہے جو ان کے افسانوی مجموعہ ''حیرت فروش'' میں شامل ہے۔اس افسانے میں سفر کی روداد بیان کی گئی ہے۔اس کہانی میں دو ہی کردار ہیں بیٹا اور ماں، جو جنگل پار کرنے کے لیے بھٹک رہے ہیں۔ ماں ایک بوڑھی عورت ہے جس کے بدن پر نہ پوری طرح کپڑے ہیں نہ پیروں میں چپل ہے بوڑھی عورت اپنے کمزور سے بدن کے ساتھ جوجھ رہی ہے۔اتنی کمزور کہ جواب لاٹھی کے سہارے چل رہی ہے اور اس کے ساتھ اس کا بیٹا اسے سہارا دیتے ہوئے سفر طے کر رہا ہے۔

افسانے کا خلاصہ یہ ہے کہ دونوں ماں بیٹے جنگل میں پتھریلی جگہ اور جھاڑیوں کے بیچ چل رہے ہیں۔سفر میں بیٹے پر ماں کی ذمہ داری کا بوجھ ہے۔ وہ بیٹے کے ہمراہ چلتی ہے۔گھسٹتی ہے اور کبھی اسے وہ اٹھا کر چلتا ہے۔پتھر پیر میں تیل بن کر چبھتا ہے تو کبھی جھاڑ سانپ بن کر ڈس رہے ہیں۔ بڑی مشکل، بڑی تکلیفیں، بڑی تھکان ہے کوئی مددگار نہیں پھر بھی یہ دونوں ایک امید لیے چل رہے ہیں۔ چلنے سے پاؤں میں چھالے پڑ گئے ہیں جس کی وجہ سے بوڑھی عورت درد سے تڑپ رہی ہے کبھی بیٹے کے سہارے تو کبھی لاٹھی کے سہارے اپنے قدم بڑھا رہی ہے۔ان مشکلات سے جوجھ رہے تھے کہ ایک اور مشکل سامنے آتی ہے۔ایک لمبی چڑھائی سے ان کا گزر ہوتا ہے۔ جہاں کبھی قدم ٹھہرتے ہیں کبھی قدم

نیچے پھسل کر گر جاتے ہیں۔ پھر بھی وہ ہمت نہیں ہارتے ہیں۔ ایک دوسرے کا سہارا بنے آگے بڑھتے ہیں۔ ان تمام مصیبتوں سے جوجھتے جوجھتے اس بوڑھی عورت کا درد حد پار کر جاتا ہے۔ اور پھر وہ وہیں گر پڑتی ہے۔

غضنفر اس افسانے کے ذریعہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جب کوئی انسان اپنی پوری عمر گزار چکا ہوتا ہے بوڑھا ہوجاتا ہے اس کا جسم اس کا ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔ تو اسے کس طرح مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بوڑھی عورت اپنے درد اور تکلیف سے تڑپتی ہے اپنے کمزور جسم کے ساتھ آگے بڑھاتی چلی جارہی ہے۔ اس کے ذہن میں ایک خیال گھومتا رہتا ہے کہ رات ہونے سے پہلے جنگل کو پار کرنا ہے۔ اسی سوچ میں ڈوبی ہوئی چلی جارہی ہے کہ اس کے سامنے اور ایک مصیبت آتی ہے کہ وہ بوڑھی عورت ایک قدم بھی چل نہیں پاتی ہے۔ اس کا درد اس کی ہمت و امید کی ہر حد کو توڑ دیتا ہے۔ افسانے کا اقتباس ملاحظہ ہو:

''کچھ دور جانے کے بعد عورت کا دم پھولنے لگا۔ اس کی لڑکھڑاہٹ میں تیزی آگئی۔''

''بیٹا! اب مجھ سے اور نہیں چلا جاتا''

''جنگل کا یہ راستہ بس تھوڑی دور اور رہ گیا ہے ماں! ہمّت سے کام لو۔ اندھیرا ہونے سے پہلے ہم جنگل پار کر جائیں گے''

''نہیں بیٹے! اب مجھ میں بالکل جان نہیں رہی اور درد بھی برداشت سے باہر ہوتا جارہا ہے'' ماں نے سینے کو ہاتھ سے دبالیا۔ کچھ دیر تک چپ رہی پھر بولی

''اب تو ایسا لگتا ہے کہ اس جنگل میں.................'' اس کی آواز ٹوٹنے لگی۔

''ایسا نہیں کہتے ماں! تمہیں کچھ نہیں ہوگا بس ذرا سی اور ہمّت کرلو''

''بیٹا! اب......'' ماں کے پاؤں ساتھ چھوڑنے لگے۔

بیٹے نے مضبوطی سے اس کا ہاتھ تھام لیا'' ١٦؎

اس اقتباس میں ماں اور بیٹے کی اندرونی کیفیت کو بیان کیا گیا ہے۔ کس طرح ماں درد و کرب میں مبتلا ہیں اور اس کے باوجود اپنے بیٹے سے محبت رکھتی ہے۔ بیٹا بھی اپنے فرض کو پورے طور پر ادا کرتا ہے۔ بیٹا اپنی پوری شدت سے ماں کا حوصلہ بنائے رکھنے کی پوری کوشش کرتا ہے۔ بوڑھی عورت اندر ہی اندر اپنے درد سے تڑپ رہی ہے جیسے جیسے وہ پہاڑ کے اوپر چڑھتی ہے اس کا درد بڑھتا جاتا ہے۔ بیٹا اپنی بوڑھی ماں کو ہمت دیتا ہے اس کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''ماں! اب ہمیں چلنا چاہیے نہیں تو اندھیرا بڑھ جائے گا اور راستہ طے کرنے میں دشواری ہوگی''

''اچھا! ماں اٹھنے کی کوشش کرنے لگی''

''آگے بڑھ کر بیٹے نے سہارا دیا۔ ماں اٹھ کر بیٹے کے ساتھ چلنے لگی''

''شاباش میری اچھی ماں! اسی طرح ہمّت کرتے جاؤ! جلد ہی ہم اس جنگل کو پار کر جائیں گے''

''ماں نے بیٹے کی شاباشی، اپنی ہمّت اور بٹوری ہوئی طاقت سے سامنے کے فراز کو طے کرلیا۔ اب وہ نشیب میں پہنچ گیا۔ نشیب کا فاصلہ آسانی سے طے ہوگیا۔ لیکن فراز پھر آ کھڑا ہوا۔ فراز سے وہ پھر جوجھنے لگا'' ١٧؎

اس مطالعہ سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس درد کی کشمکش میں بوڑھی عورت کے مسائل مزید بڑھنے

لگتے ہیں۔اس کا جسم کا حصہ اس کا ساتھ چھوڑنے پر تیار ہورہا ہے۔درد شدید سے شدید تر ہوتا جاتا ہے۔ اس کی سانس بھی ساتھ چھوڑنے پر مجبور ہورہی ہے۔ درد سے دل کو تھام لیتی ہے۔ پھر بھی درد نہیں تھمتا ہے۔ اسے محسوس ہوتا ہے کہ اب وہ اور درد برداشت نہیں کرسکتی ہے۔جسم تو پہلے ہی اس کا ساتھ چھوڑ چکا تھا اب اس کی سانسیں بھی ساتھ چھوڑنے کے لیے تیار ہے۔اس کی امید ٹوٹتی چلی جارہی تھی۔ اب یہ فکر بے چین کرنے لگا کہ کہیں جنگل میں ہی اس کی سانس نہ رک جائے۔جنگل کا منظر آخری منظر نہ بن جائے۔

غضنفر نے اس افسانے میں ایک ماں کے جذبات کو بیان کیا ہے۔ایک عورت جو کسی بھی حال میں رہے اپنے بچوں سے پیار کرنا نہیں بھولتی ہے۔اُس کی فکر میں رہتی ہے۔اسی طرح اولاد بھی اپنی ماں سے پیار کرتے ہیں اور انھیں درد میں نہیں دیکھ پاتے ہیں۔افسانے کا اقتباس ملاحظہ ہو:

''ماں!اب تم میری پیٹھ پر سوار ہوجاؤ!''

''تم تھک جاؤ گے بیٹے!''

''نہیں، میں نہیں تھکوں گا۔جلدی کرو ماں!نہیں تو اندھیرا ہوجائے گا'' اس نے جھک کر ماں کو دونوں ہاتھوں سے بوری کی طرح اپنی پیٹھ پر لادلیا۔

کچھ دیر کے بعد اس کی سانس اکھڑنے لگی۔ پاؤں کچھ زیادہ ہی لڑکھڑانے لگے بیٹے کی حالت ماں سے دکھی نہیں گی۔ماں بولی۔

''اب مجھے اتار دو میں خود چلنے کی کوشش کرتی ہوں''

''نہیں ماں!تم بیٹھی رہو میں لے چلتا ہوں''

''نہیں بیٹے!میں خود چلوں گی۔لگتا ہے مجھ میں اب کچھ دم آگیا ہے''

''اچھا؟اس نے ماں کواپنی پیٹھ سے نیچے اتار دیا'' ۱۸ؔ

اس اقتباس سے پتہ چلتا ہے کہ ایک عورت کے اندر ممتا بھری رہتی ہے وہ اپنے بچے کو درد میں نہیں دیکھ سکتی۔اس کے لیے وہ خود ہزاروں درد برداشت کرسکتی ہے۔بوڑھی عورت کی طرف سے بیٹے کی فکراندرونی جذبات درد سے بھرے الفاظ دیکھنے کو ملتے ہیں۔اس افسانے میں جہاں ماں کے درداور بیٹے کی فکر دکھائی گئی ہے وہیں ماں کوبھی بیٹے کی فکرکرتے دیکھایا گیا ہے۔راستہ چلتے وقت جب ماں کواحساس ہوتا ہے کہ میرالال بھی تھک چکا ہے۔اس کا بھی بدن درد کومحسوس کررہا ہے۔اسے بھی آرام کی ضرورت ہےتو اپنے درد کو بھول کر بیٹے کو بیٹھنے کوکہتی ہے تاکہ بیٹے کوآرام مل سکے۔

غضنفر اپنے افسانوں میں انسان کی زندگی کے درپیش مسائل کو بیان کرتے ہیں۔ان کی نگاہ آج کے سماج میں ہونے والے ہر مسئلہ پر ہوتی ہے۔ان کے افسانے بے مثال ہوتے ہیں۔جس میں زندگی کی تصویر ہوتی ہے۔

غضنفر کا دوسراافسانوی مجموعہ''پارکنگ ایریا'' ہےجس میں کل 20 افسانے ہیں۔ یہ افسانے وقفہ وقفہ سے ملک کے مختلف موقر رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان افسانوں کے موضوعات ہمارے آس پاس کی جیتی جاگتی زندگی کےموضوعات ہیں۔غور سے دیکھا جائےتو یہ افسانوی مجموعہ ایسا نگارخانہ ہےجس میں ہم اپنی عصری زندگی کےمختلف رنگوں کوآتا جاتا محسوس کرتے ہیں۔

غضنفر کاافسانوی مجموعہ''پارکنگ ایریا''ان کی عصری حسیت کا آئینہ دار ہے۔سماجی مسائل کے بارے میں ان کی فکروتشویش کم وبیش ہر کہانی میں محسوس کی جاسکتی ہے۔انھوں نے اپنی تخلیقات میں فن کے اصولوں سے سمجھوتہ کیے بغیر عہد حاضر کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ساتھ ہی آج کے انسان کی داخلی وخارجی زندگی کی الجھنوں کواپنا فکری محور بنایا ہے۔

مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ فکشن ہو یا شاعری، تدریس ہو یا تنقید ہر جگہ انھوں نے اپنے مطالعہ و مشاہدہ کو اپنا رہنما بنایا ہے۔ مگر جو انھوں نے اپنے افسانوی مجموعے ''پارکنگ ایریا'' میں موضوعات پیش کیے ہیں وہ سب سے انوکھے اور الگ ہے۔ غضنفر کا انداز بیان اتنا پر اثر ہوتا ہے کہ قاری کے ذہن پر اثر کرتا ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں خواتین کے ان مسائل کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے جو ہمارے سماج میں درپیش آتے رہتے ہیں۔ ان کے کچھ ایسے افسانے ہیں جو اپنے آپ میں لاجواب ہیں ان میں ایک افسانہ ''محبت کے رنگ'' ہے جس میں انھوں نے ایک لڑکی کو درپیش مسائل بیان کیے ہیں۔

اس افسانے میں محبت اور رشتے کے رنگ بتائے گئے ہیں کہ محبت کے کئی رنگ ہوتے ہیں محبت کے کئی نام ہیں۔ جیسے خدا سے محبت، ماں باپ سے محبت، اولاد سے محبت، دوستوں سے محبت، استاد اور شاگرد سے محبت غرض محبت کے کئی رنگ و روپ ہیں۔ لیکن ضروری ہے کہ ہم جس نظر سے آنے والے کو دیکھ رہے ہوتے ہیں وہ بھی اسی طرح آج کے سماج میں ہر کوئی عورت کو ہوس کی نظر سے دیکھتا ہے۔ عورت کی محبت و محنت کا سیلہ اسے غلط بتا کر کہا جاتا ہے۔

اس افسانے کا مرکزی کردار ثمینہ ہے جو نہایت ہی خوش مزاج ہے۔ اس کے علاوہ ماسٹر اشفاق ہے جو ثمینہ کے استاد ہیں۔ کہانی مختصر یہ ہے کہ اشفاق، ثمینہ کا استاد رہے۔ ثمینہ اپنے استاد کی بہت عزت کرتی ہے اسے محبت کی نظر سے دیکھتی ہے اس کی دیکھ بھال کرتی ہے اس کا خیال رکھتی ہے طرح طرح سے ان کی خدمت کرتی ہے۔ کبھی تیل کی مالش کرتی ہے تو کبھی سر میں بام لگاتی ہے مگر اشفاق اس کی خدمت و محبت کو غلط سمجھتا ہے اور اسے اپنے پیار کا اظہار کر دیتا ہے۔ جب ثمینہ کو اس بات کا پتہ چلتا ہے تو وہ کہتی ہے کہ میں آپ کی بہت عزت کرتی ہوں محبت کرتی ہوں مگر میری محبت وہ نہیں جو آپ سمجھتے ہیں۔

اس افسانے میں ثمینہ جیسی نیک سیرت اور معصوم لڑکی کو کردار کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ جو صورت کے ساتھ ساتھ سیرت میں بھی لاجواب ہے۔ ثمینہ ایک نوجوان خوبصورت اور پرکشش لڑکی تھی۔ رنگ وروپ میں لاجواب تھی۔ افسانے کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''ماسٹر صاحب! بٹن کھولیے، تیل مالش کردوں''

میں جھجھکا تو خود اس کی انگلیاں میری قمیض کے بٹنوں تک پہنچ گئیں۔

''رہنے دو ثمو! کچھ دیر میں درد یونہی چلا جائے گا''

''یونہی کیسے چلا جائے گا۔ درد یونہی چلا جاتا تو پھر یہ دوائیں کیوں ایجاد ہوتیں؟ تکلیف نہ کیجیے۔ ہاتھ اٹھائیے اور مجھے اپنا کام کرنے دیجیے''

''بے کار میں تم ضد کررہی ہو''

''ضد میں نہیں، آپ کررہے ہیں ، پلیز ہاتھ ہٹائیے، ورنہ درد بڑھتا چلا جائے گا اور اگر خدانخواستہ درد زیادہ بڑھ گیا تو اس وقت کوئی ڈاکٹر بھی نہیں ملے گا'' 19

اس افسانے میں غضنفر نے ایک ایسے ماسٹر کو پیش کیا ہے جس کے لیے ان کی شاگرد ان کی بیٹی کے برابر تھی اس کے باوجود اس پر گندی نظر رکھتا ہے۔ اس کی محنت کو غلط ثابت کرتا ہے۔ ثمینہ جو کہ انسانیت کے ناطے ان کی مدد کررہی تھی ان کے درد میں ان کا ساتھ دے رہی تھی اور اس کا معصوم دل ان کی بڑی مدد کررہا تھا۔ مگر استاد نے غلط مطلب لے لیا۔ جب ثمینہ ماسٹر صاحب کے سینے کے درد کے کرب کو سن کر اچانک آجاتی ہے اور ان کی خدمت کرتی ہے۔ تب ماسٹر کچھ اور ہی سمجھ جاتا ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''ممتا اور محبت کے اس پیکر کے کھونے اور اپنے خالی ہو جانے کا سارا کرب میری آنکھوں میں سمٹ آیا۔ روشن دیدوں میں پانی بھر آیا۔ پیکر اس پانی میں ڈوب گیا۔ دیر تک میں رومال سے نم آلود اور بوجھل پلکوں کو صاف کرتا رہا۔ رومال ہٹا تو میری نگاہوں نے دیکھا کہ ثمینہ کی نظریں میری آنکھوں پر مرکوز تھیں۔ وہ یک ٹک مجھے دیکھے جا رہی تھی جیسے وہ کچھ تلاش کر رہی ہو اور اس کی نرم گرم انگلیاں اور بھی مستعدی سے میرے سینے پر پھر رہی تھیں۔ اس متلاشی آنکھیں اور رقص کناں انگلیاں دونوں مجھے اچھی لگیں۔ میری نگاہیں متلاشی آنکھوں پر مرکوز ہو گئیں۔ اس بار وہ مجھے پر اسرار بھی لگیں۔ مجھے یہ بھی محسوس ہوا جیسے وہ میرے اندر اترتی جا رہی ہوں اور شاید کچھ کہنا بھی چاہ رہی ہوں۔ میں دیر تک ثمینہ کی آنکھوں کی پر اسراریت کو پڑھنے کی کوشش کرتا رہا۔ پھر اچانک میرے ذہن میں عجیب و غریب قسم کے خیالات ابھرنے لگے۔ پہلے تو میں ان خیالوں کو ادھر ادھر جھٹکتا رہا۔ بعد میں مجھے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے ہم اس کمرے سے دور ہوتے جا رہے ہیں اور ہمارے اردگرد کی ایک ایک چیز کا رنگ بدلتا جا رہا ہے۔'' [۲۰]

اس اقتباس سے پتہ چلتا ہے کہ ثمینہ کس قدر نیک دل اور دردمند لڑکی ہے۔ لیکن ماسٹر صاحب کے لیے اس کی فکرمندی ظاہر ہوتی ہے۔ کیوں کہ ثمینہ ایک نیک اور دردمند لڑکی ہوتی ہے جس سے دوسرے کا درد برداشت نہیں ہو پاتا ہے۔ ثمینہ نے نہ صرف ماسٹر صاحب کے سینے کے درد کو تیل کی مالش سے دور کیا بلکہ اس نے اپنے استاد کے کپڑے بھی صاف کیے۔ مگر ثمینہ کی اس فکرمندی سے ماسٹر صاحب

کے دل میں اس کے لیے محبت پیدا ہوگئی وہ اس کو ایک الگ نظر سے دیکھنے لگے جو آج کے سماج میں عام ہو گیا ہے۔ جب کوئی اپنے مطلب کے لیے دوسروں کو استعمال کرتا ہے۔ ایک لڑکی سب سے زیادہ اپنے ماں باپ کے بعد استاد کی عزت کرتی ہے اسے مانتی ہے۔ ثمینہ نے بھی یہی کیا پر بدلے میں استاد اسے الگ ہی نظر سے دیکھنے لگے۔ حالانکہ ثمینہ کے ارادے نیک تھے۔ وہ تو اپنی دنیا میں مگن تھی۔ وہ ماسٹر صاحب کو بھی کبھی پھول لے کر دیتی تو کبھی کچھ تو کبھی کچھ۔ ان سب سے ماسٹر صاحب جب متاثر ہو گئے تھے اور وہ ان سب کا غلط مطلب سمجھ بیٹھے جیسا کہ اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے:

''میری آنکھوں کی زبان تو ناکام ہو ہی گئی تھی، لگتا ہے انگلیوں کی زبان بھی اپنی کوشش میں کامیاب نہ ہو پائی۔ میں کیا کروں کہ زبان کھولے بنا میرے دل کا حال آپ کے دل تک پہنچ جائے۔ آپ تو جانتے ہیں کہ میں ایک عورت ہوں اور عورت اس معاملے میں اپنے لب نہیں کھولتی'' ۲۱

اس اقتباس سے پتہ چلتا ہے کہ ثمینہ کے تئیں ماسٹر صاحب کے دل میں ایک نیا احساس پیدا ہوتا ہے اور ان کو ثمینہ سے محبت بڑھتی جاتی ہے۔ انھیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ ثمینہ بھی ان سے محبت کرتی ہے۔ اسی خوشی میں ایک دن ثمینہ جب ان کے سر میں مالش کرنے کے لیے آتی ہے تو ماسٹر صاحب نے اپنے تکیہ کے نیچے پڑا خط ثمینہ کے ہاتھ دیا جس میں ماسٹر صاحب نے اپنی محبت کا اظہار کیا تھا اس کے بعد وہ چلی جاتی ہے۔ دوسرے دن ثمینہ ایک الگ رفتار سے ان کے کمرے میں آتی ہے اور ناشتے کے ساتھ ساتھ ایک لفافہ میز پر رکھا جس میں ایک خط تھا وہ خط یہ تھا:

محترم ماسٹر صاحب!

تسلیم

آپ نے لکھا ہے کہ میں تمھیں نہیں سمجھ سکا تو واقعی آپ مجھے نہیں سمجھ سکے۔ آپ نے اپنے چہرے پر جمی میری آنکھیں دیکھ کر اور ان میں محبت کی جھلک محسوس کر کے اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے لیکن آپ کو غلط فہمی ہوئی۔ آپ پر مرکوز ہونے والی میری نگاہیں خلوص اور محبت سے بھری ضرور تھی مگر وہ ایک بہن کی آنکھیں تھی جو اپنے بھائی کے چہرے پر پھیلے ہوئی اداسیوں کے ڈورے اور بھیگی ہوئی آنکھوں میں تیرتے ہوئے غموں سے اس کی زندگی کے خلاء اور محرومیوں کا اندازہ کر رہی تھی۔ افسوس کہ میں آپ کی خواہش کی تکمیل نہیں کر سکتی۔ ۲۲؎

آپ کی بہن

ثمینہ

اس افسانے میں محبت کے رنگ کے کئی پہلو دکھائی دیتے ہیں۔ ثمینہ جو ماسٹر صاحب کو ایک بھائی کی نظر سے دیکھ رہی تھی اس کے ماسٹر صاحب نے اس کا غلط مطلب نکالا۔ جو آج کے ہمارے سماج کا حصہ ہے۔ آج عورت کے لیے جو سب سے بڑے مسئلے پیش آتے ہیں وہ یہ ہے کہ ہر عورت کو غلط نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ہر عورت جو گھر پر رہتی ہوں اسکول اور کالج جانے والی لڑکیاں، دفتر میں کام کرنے والی خواتین ان کے ساتھ یہ پیش آتے ہیں۔ کچھ لوگ اس بات کو سمجھ جاتے ہیں جیسے ماسٹر صاحب نے خط پڑھا تو انھیں بہت برا لگا وہ اپنی سوچ پر شرمندہ ہوئے۔ کیوں کہ استاد اور شاگرد کا ایک پاک رشتہ ہوتا ہے۔

غضنفر کا ایک اور افسانہ ''حکمت'' ہے جو ان کے افسانوی مجموعہ ''پارکنگ ایریا'' میں شامل

ہے۔اس کے انداز بیان میں انھوں نے اپنے فنکارانہ صلاحیت پیش کیے ہیں۔غضنفر نے اس افسانے میں سماج پر ہونے والے برائی کو بیان کیا ہے۔جو گاؤں اور گھر ہر جگہ موجود ہے۔

اس افسانے میں ایک عورت کی درد و بے عزتی کو اپنے درد بھرے انداز میں بیان کیے ہیں۔ ہمارے سماج میں عورت کو ایک بدعا، ایک بری آتما، منہوس کے نام سے پکارتے ہیں۔اگر کسی کے گھر پر کوئی حادثے ہوتا ہے تو اس کا ذمہ دار عورت کو ہی مانتے ہیں۔اگر خوشی آئی تو نہیں۔سماج میں گھر میں ہر طرف عورت ظلم و ستم کا شگار ہوتی ہے۔اس کے علاوہ ایک عورت کو جب کسی چیز کا ذمہ دار ٹھرایا جاتا ہے تو اس کی جذبات ختم ہو جاتے ہیں۔اس کا درد بڑھ جاتا ہے۔پر اس درد کو کوئی نہیں دیکھتا ہے۔

جو اپنے گاؤں اور گاؤں والوں کے ظلم کا شکار بن گئی ہے۔وہ اس لیے کہ جب وہ شادی ہو کر آتی ہے کسی وجہ سے اس کا شوہر اور ساس سسر مر جاتے ہیں۔پر سماج میں اس کا ذمہ دار اسے کئی مانتے ہیں۔اس کے باوجود وہ ہر درد کو برداشت کرتی ہے۔سب سے ملتی ہے۔سب کے دکھ درد میں شامل ہوتی ہے۔اس کے باوجود ایسے ایک دن ایسے مسائل سامنے آتے ہیں جو نہ وہ کبھی سوچی ہوں نہ اس کے ذہن میں آسکتی ہے۔اس عورت کو اس طرح سماج میں بے عزت کیا جاتا ہے جس کی حد نہیں ہوتی ہے۔ افسانے کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

> ''ہمارے گاؤں میں ایک عورت تھی۔نہایت بے باک، ملنسار، پرخلوص اور دردمند، ہر ایک کے دکھ سکھ میں فوراً پہنچ جاتی تھی مگر اس کے اس اعلا انسانی رویے کو شک کی نظر سے دیکھا جاتا۔لوگوں کو اس خلوص اس کی کوئی چال لگتی۔ شک کی بنیاد شاید یہ بھی تھی کہ اس کے آتے ہی اس کے ساس سسر اور پھر اس کے شوہر تینوں موت کے گھاٹ اتر گئے تھے حالاں کہ وہ تینوں کسی مہاماری

کے شکار ہوئے تھے۔ ایک بار کسی بیماری کی ہوا چلی۔ گاؤں کے کئی گھروں کے بچے اس وبا کی لپیٹ میں آ گئے۔ اسے پتا چلا تو وہ بھاگی بھاگی انھیں دیکھنے گئی۔ اتفاق سے بچوں کی حالت اور بگڑ گئی اور ان میں سے ایک نے دم توڑ دیا۔ پھر کیا تھا الزام اس عورت کے سر منڈھ دیا گیا اور ناکردہ جرم کے پاداش میں اسے ننگا کر کے نچایا گیا۔ وہ بے چاری۔ چیختی چلاتی اور گڑگڑاتی رہی۔ اپنی بے گناہی پر آنسو بہاتی رہی مگر کسی کو بھی اس پر رحم نہیں آیا۔ وہ لوگ بھی خاموش تماشائی بنے رہے جو یہ سمجھتے تھے کہ بچے کی موت کا اصل سبب کیا تھا اور وہ عورت واقعی بے قصور تھی۔ صرف ننگا کرنے سے لوگوں کا جی نہیں بھرا، جلتی لکڑی سے اسے داغا بھی گیا اور اس طرح داغا گیا کہ اس کے جسم کی چربی باہر نکل آئی۔۔۔ عورت کا قصہ بیان کرتے کرتے اچانک اس کی زبان بند ہوگئی اور آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے ٹپک پڑے جیسے اس کی پتلیوں میں گرم سلائیاں پھیر دی گئی ہوں'' ۲۳ؔ

اس اقتباس سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے سماج میں انسان کس حد تک گر گیا ہے۔ ایک عورت جو اپنی رحم دلی سے سب سے محبت کرتی ہے ہر کسی کی دکھ میں شامل ہوتی ہے۔ سب سے خلوص و پیار سے ملتی ہے بدلے میں اس کے ساتھ حد رجہ برا سلوک کیا جاتا ہے۔ اسے پورے زمانے کے سامنے بے عزت کیا جاتا ہے۔

غضنفر کہتے ہیں کہ اس عورت کی چیخ پکار آج کے سماج میں کوئی نہیں سنتا ہے۔ سب چپ چاپ تماشا دیکھتے ہیں۔ اور مزہ لیتے ہیں۔ عورت اپنی بے بسی پر روتی ہے چیختی ہے گڑگڑاتی ہے کوئی اس کی آواز

نہیں سنتا ہے۔ ہر کوئی اس پر ظلم کرتا ہے۔عورت کتنی مجبور ہوتی ہے ہر درد کو برداشت کرتی ہے۔

کہانی یہ ہے کہ دولوگ آپس میں باتیں کرتے ہیں ایک کہتا ہے کہ ہمارا سماج کس حد تک برا ہے۔اور وہ عورتوں کے ساتھ کس طرح کا سلوک کرتا ہے۔دوسرے کے پوچھنے پر ایک عورت کی کہانی بیان کرتا ہے۔

افسانہ ''درد کی کمی کا کرب'' ایک مشہور افسانہ ہے یہ افسانوی مجموعہ ''پارکنگ ایریا'' میں شامل ہے۔یوں تو غضنفر کے ہر افسانے میں ایک نیا پن ہوتا ہے۔مگر اس افسانے میں انھوں نے انسان اور جانور کے بیچ رشتہ اور خواتین کی اندرونی کیفیت کو اجاگر کیا ہے۔

اس افسانے کا مرکزی کردار اظہار الدین، معمر خاتون اور اس کا کُتّا گلفام ہے۔کہانی یہ ہے کہ معمر خاتون گلفام کو لے کر ہر صبح رننگ کے لیے آتی ہے یہاں پر اظہار الدین اسے دیکھتا ہے اور کہتا ہے کہ اپنے ایک کتے کو اتنے پیار کرتی ہے تو پھر کیوں فٹ پاتھ پر رہنے والے بچے کو نہیں پال لیتی۔معمر خاتون بتاتی ہے کہ اس نے یہ سب کچھ کیا کبھی فٹ پاتھ کے عورتوں کو گھر لا کر رکھی تو کبھی بچوں کو پر سب نے اسے دھوکہ دیا۔اس کے جذبات سے کھیلا۔اسے اندر ہی اندر تکلیف دیے۔

جہاں تک ان کے افسانوں میں خواتین کے مسائل کی بات ہے ان کے دکھ درد کی بات ان کے افسانے میں جا بجا نظر آتے ہیں۔ان کے پیش کرنے کا انداز بہت انوکھا ہوتا ہے۔وہ ہر مسئلے کو سنجیدگی سے دیکھتے ہیں۔اس افسانے میں انھوں نے ایک عورت کے زندگی میں آنے والے واقعات کو اس کی زبانی پیش کیے ہیں کہ کس طرح وہ اپنے حالات سے جوجھتی ہے کس طرح اس سے درد محسوس کرتی ہے۔ افسانے کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

''اچھا! یہ۔ ہاں، یاد آیا۔ بات یہ ہے مسٹر اظہار کی فٹ پاتھوں پر پڑے ان

لوگوں کے حالات مجھے بھی کبھی بہت بے چین کرتے تھے اور میں ان کے حالات کو بدلنے کی فکر بھی کیا کرتی تھی۔ایک آدھ بار اس کے لیے میں نے ذاتی طور پر عملی اقدامات بھی کیے۔مثلاً ایک کنبے کو پالا۔سڑک سے اٹھا کر انھیں اپنے بنگلے میں لائے۔اپنے آؤٹ ہاؤس میں انھیں رہنے کی جگہ دی۔ ان کے لیے کپڑے بنوائے۔ان کے کھانے پینے کا انتظام کیا۔کافی دنوں تک ہم ان کو اپنے پیسوں سے پالتے رہے مگر ایک دن میں نے دیکھا کہ اس کنبے کی عورت نے میری جگہ لینے کی کوشش شروع کر دی تھی اور اس کوشش میں مسلسل آگے بڑھتی جا رہی تھی۔اس کے ہاتھ پاؤں جب بہت لمبے ہو گئے تو مجھے مجبوراً انھیں اپنے گھر سے نکالنا پڑا۔'' ۲۴

اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ عورت ممتا کی دیوی ہوتی ہے۔تو شیطان بھی ہوتی ہے۔معمر خاتون نے ہمدردی سے دوسری عورت کو گھر پر جگہ دیتی ہے بدلے میں وہ اس کا گھر برباد کرنے پر آمادہ ہو جاتی ہے۔ایک عورت سب برداشت کر سکتی ہے مگر اپنے شوہر کو کوئی بری نظر سے دیکھے یہ برداشت نہیں کر سکتی ہے۔معمر خاتون کو جب پتہ چلتا ہے کہ جسے اس نے رحم دلی سے گھر پر جگہ دی ہے اس نے ہی اس کا گھر برباد کر رہی ہے۔اس کے اندرونی جذبے ٹوٹ جاتے ہیں۔اور وہ اسے گھر سے نکال دیتی ہے۔

غضنفر کہتے ہیں کہ جب کوئی عورت کسی کے پاس جاتی ہے تو قصور صرف عورت کا نہیں ہوتا بلکہ مرد کا بھی ہوتا ہے۔جب معمر خاتون کہتی ہے کہ وہ عورت میرے شوہر پر بری نظر ڈالتی تھی یہ بات غلط بھی ہو سکتی ہے کہ اس کا شوہر بھی تو بری نظر ڈال سکتا ہے۔افسانے کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

''اور مان لیں کہ وہ واقعات سچے بھی ہوں تب بھی قصوروار صرف وہ عورت

اور وہ بچہ کہاں ٹھہرتے ہیں؟ ہوسکتا ہے قصور سراسر معمر خاتون کے شوہر کا ہو۔
اس نے ہی اس عورت کو اپنی طرف آنے کا لالچ دیا ہو۔ کھانا، وہ بھی اچھا
کھانا اگر بھوکے کو دعوت دے تو بھوکا بے چارہ اپنے کو کب تک اور کیسے
روک سکتا ہے؟'' ۲۵

دوسری جگہ یہ کہتے ہیں کہ جب کوئی شوہر پریشان رہتا ہے اس کی بیوی اس سے بھی زیادہ پریشان ہو جاتی ہے۔ جو ہر گھر میں عورت کی کہانی ہوتی ہے۔ ایک عورت ہمیشہ ہی چاہتی ہے کہ اس کا شوہر کسی تناؤ میں نہ رہے خوش رہے مگر جب وہ اسے اداس دیکھتی ہے خود فکرمند ہو جاتی ہے۔ افسانے کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

''وہ گھر میں گم سم رہنے لگے جیسے ان کو لقوہ مار گیا ہو۔ ان کی اس کیفیت نے
ان کی بیوی کو بھی پریشان کر دیا۔ ایک دن بیوی ان کے قریب آ کر بولی:
''تم آج کل کھوئے کھوئے سے رہتے ہو! کوئی بات ہو گئی ہے کیا؟''
جواب دینے کے بجائے اظہار الدین نے سوال کر دیا۔
''تم نے آج کی خبر پڑھی؟'' جواب میں بیوی نے سوال کیا۔
''کون سی خبر؟'' اظہار الدین چونکے۔
''اچھا، تو تم نے نہیں پڑھی؟''
''بتاؤ تو سہی، کون سی خبر؟''
''یہی کہ ایک بیٹے نے اپنے باپ کا گلا کاٹ دیا۔''
''اچھا! مگر کیوں؟'' اظہار الدین کی حیرانی اور بڑھ گئی۔

''بیٹا چاہ رہا تھا کہ باپ اپنی ساری زمین جائداد بیٹے کے نام کردے مگر
باپ کا کہنا تھا کہ جلدی کیا ہے۔ ہمارے بعد سب کچھ تو اسی کا ہے پھر لکھائی
پڑھائی کی کیا ضرورت ہے؟'' ۲۶

اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ایک عورت ہر وقت اپنے گھر اور شوہر کو خوش حال دیکھنا چاہتی ہے۔ جب اظہار الدین غم گین ہوتا ہے۔ اور اپنی سوچ میں ڈوبا رہتا ہے تو اسکی بیوی پریشان ہو جاتی ہے پر شوہر اپنی بیوی کو جواب دینا ضروری نہیں سمجھتے ہیں۔ وہ تو بس صرف اپنی ہی بات پر رہتے ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ غضنفر نے اپنے افسانے میں عورت کے اندرونی درد کو دیکھانے کی کوشش کی ہے۔

*****

حواشی

۱ بحوالہ افسانہ: ہاؤس ہوسٹس/غضنفر علی/ حیرت فروش/ص:24

۲ ایضاً 23

۳ ایضاً 25

۴ ایضاً 24

۵ ایضاً 26

۶ بحوالہ افسانہ: خالد کا ختنہ/غضنفر علی/ حیرت فروش/ص:69

۷ ایضاً 70

۸ بحوالہ افسانہ: آٹے کی دلدل/غضنفر علی/ حیرت فروش/ص:102

۹ ایضاً 102

۱۰ ایضاً 102-103

۱۱ بحوالہ افسانہ: ملبے پر کھڑی عمارت/غضنفر علی/ حیرت فروش/ص:117

۱۲ ایضاً 117

۱۳ بحوالہ افسانہ: منگول بچہ/غضنفر علی/ حیرت فروش/ص:192-191

۱۴ ایضاً 191

۱۵ ایضاً 192

۱۶ بحوالہ افسانہ: جنگل/غضنفر علی/ حیرت فروش/ص:235

۱۷ ایضاً 236

۱۸ ایضاً 236

۱۹ بحوالہ افسانہ: محبت کے رنگ/غضنفر علی/ پارکنگ ایریا/ص: 54

۲۰ ایضاً 55

۲۱ ایضاً 58

۲۲ ایضاً 62

۲۳ بحوالہ افسانہ: حکمت/غضنفر علی/ پارکنگ ایریا/ص: 159

۲۴ بحوالہ افسانہ: درد کی کمی کا کرب/غضنفر علی/ پارکنگ ایریا/ص:80

۲۵ ایضاً 82

۲۶ ایضاً 83

ماحصل

غضنفر علی 9 مارچ 1953 کو ضلع گوپال گنج صوبہ بہار کے ایک گاؤں (چوراؤں) میں پیدا ہوئے۔ان کے والد کا نام عبدالعزیز تھا۔ان کی والدہ ایک نیک خاتون تھیں۔جن کا اثر غضنفر کی شخصیت پر صاف نظر آتا ہے۔ابتدائی تعلیم گاؤں کے مدرسہ میں حاصل کی۔اس کے بعد 1970 میں وی۔ایم۔ایم۔ایچ۔ای۔اسکول گوپال گنج سے ہائر سکنڈری سے کامیاب کیا۔علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی میں ایم۔اے امتیازی نمبرات کے ساتھ پاس کیا۔1982 میں مولانا شبلی نعمانی کے تنقیدی نظریات پر مقالہ لکھ کر پی ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی۔علی گڑھ میں تعلیم کے دوران انھیں بہت اچھے اساتذہ ملے ان میں سب سے زیادہ قریب وہ شہریار سے تھے جن سے انھیں بے انتہا لگاؤ تھا۔اس کے بعد ان کی ملاقات گوپی چند نارنگ سے ہوئی جنھوں نے ان کی شخصیت کو نکھارنے میں بہت اہم رول ادا کیا۔

غضنفر طالب علمی کے زمانے سے ہی بے حد فعال اور سرگرم رہے۔انجمن اردو معلّٰی کے سیکریٹری اور علی گڑھ میگزین کی مجلس ادارت کے ممبر کی حیثیت سے ان کی کارکردگی قابل تحسین ہے۔علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد انھیں علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی ہی میں ملازمت کرنے کا شوق بھی تھا۔خدا نے ان کی مدد کی اور وہ 1997 میں علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے ایک انٹرویوں میں شرکت کی اور بحیثیت ریڈر شعبۂ اردو میں ان کا تقرر عمل میں آیا۔

غضنفر کی پہلی تخلیق نثر میں ''کوئلے سے ہیرا'' نام کا ایک ڈرامہ ہے جو انھوں نے 1971 میں لکھا۔یہ ڈرامہ پہلے ہندی میں پھر اردو میں اسی نام سے شائع ہوا۔عام طور پر نوجوان تخلیق کار شاعری کی طرف پہلے راغب ہوتے ہیں بعد میں نثر کی طرف ان کا رجحان ہوتا ہے۔مگر غضنفر نے پہلے کہانیاں لکھیں پھر شاعری کی طرف متوجہ ہوئے۔ان کی تخلیقی کاوش نظم اور نثر دونوں ایک ساتھ جاری رہیں۔اسی دوران

ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ''مشرقی معیار نقد'' 1978 میں شائع ہوا۔اس کے بعد ناول ''پانی'' لکھے۔ناول ''پانی'' کی غیر معمولی شہرت نے غضنفر کو ناول نگاری کی طرف مزید متوجہ کیا پھر تو انھوں نے یک بعد دیگرے ناول لکھے۔ ناول نگاری میں بے پناہ شہرت حاصل کی ناولوں کے ساتھ ساتھ وہ افسانہ نگاری سے دور نہیں رہے بلکہ افسانوں کے ذریعہ سماج کے درپیش مسائل پر قلم اٹھایا۔غضنفر کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ''حیرت فروش'' 2005 اور ''پارکنگ ایریا'' 2016، میں شائع ہوئے۔ان نثری تخلیقات کے ساتھ ساتھ وہ شاعری کی طرف بھی راغب ہوئے۔ جن میں ''آنکھ میں لکنت'' 2015، ''سخن غنچہ'' 2015، ''مثنوی کرب جان'' 2016، بچوں کی نظموں کا مجموعہ اور ''خوش رنگ چہرے'' 2018 میں منظر عام پر آچکے ہیں۔غضنفر کی تخلیقی صلاحیتوں کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان کے ناولوں اور افسانوں میں انشا پردازی کے عناصر بخوبی نظر آتے ہیں۔اس کے علاوہ انھوں نے خاکے کی صنف میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔تحقیق وتنقید میں بھی غضنفر نے نمایاں کام انجام دیے ہیں۔

اردو فکشن نے پریم چند کے بعد متواتر عروج کے منازل طے کیے اور ترقی پسند تحریک جدیدیت سے ہوتے ہوئے آج مابعد جدیدیت تک اردو فکشن میں بھی کئی تجربات ہوئے ۔ اردو فکشن میں جن فنکاروں نے بڑی تیزی سے اپنی جگہ بنائی ہے ان میں غضنفر کا نام قابل ذکر ہے۔یوں تو ان سے پہلے بہت سے افسانہ نگاروں نے افسانے لکھے اور لکھ بھی رہے ہیں مگر غضنفر کا لکھنے کا انداز سب سے الگ اور انوکھا ہے۔غضنفر کے افسانوں میں عورتوں کی حیثیت اوران کے سیاسی ،سماجی ،اخلاقی مسائل کی عکاسی ملتی ہے۔سماج سے جڑے خواتین کے مسائل کو پیش کرنا ہی میرے مقالے کا اہم مقصد ہے۔عورت جو سماج میں مختلف مسائل کا سامنا کرتی ہے۔ پیدائش سے لے کر بچپن بھر جوانی اور بڑھاپے تک اس کی زندگی میں بے شمار حادثات آتے ہیں۔جیسے قدیم زمانے میں لڑکی کو زندہ درگور کرنے کا مسئلہ۔اس سے بچ کر

نکلے تو بچپن کی شادی آجاتی ہے۔جن میں بیوہ کی زندگی بھی گزارنی پڑتی ہے۔اکثر ظلم وستم وغیرہ کا نشانہ بنتی ہے۔جب اعلیٰ تعلیم کی بات آتی ہے تو تعلیم حاصل کرنا بھی ایک بڑا مسئلہ بن جاتا ہے۔عام سوچ یہ ہوتی ہے کہ لڑکیاں اعلیٰ تعلیم حاصل نہیں کرسکتی پھر وہ چاہیں کتنی بھی ذہین کیوں نہ ہوں۔اگر کر بھی لیں تو کیا فائدہ ایک نہ ایک دن بیاہ کرنا ہی ہے۔

ادب کے بیشتر افسانہ نگاروں نے عورتوں کو اپنے افسانے کا موضوع بنایا ہے۔لیکن غضنفر کا انداز ان سب سے الگ ہے۔وہ اپنے افسانوں میں زندہ کردار کو پیش کرتے ہیں۔اسی پہلو میں ان کا ایک مشہور افسانہ ''ہاؤس ہوسٹس'' ہے۔جو ان کے افسانوی مجموعہ ''حیرت فروش'' میں شامل ہے۔اس افسانے میں ایک ہاؤس ہوسٹس کی کہانی کو بیان کیا گیا ہے جو کہ مسٹر چوپڑا کے گھر میں اپنی خدمات انجام دے رہی ہے۔بظاہر اس افسانے میں ہاؤس ہوسٹس پر کوئی ظلم وستم نہیں ہورہا ہے۔لیکن اس کہانی کے ذریعہ ایک خاتون کے مسائل کو دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''دیکھو بیٹے ٹھیک سے اسکول جانا راستے میں کہیں اِدھر اُدھر نہ رکنا چھٹی ہونے پر سیدھے گھر پہنچنا لنچ ٹائم میں لنچ ضرور رکھا لینا۔بھولنا نہیں۔پیاس لگے تو پانی صرف اپنی بوتل کا پینا۔اور سنو ایک قدم آگے بڑھ کر اس نے بچے کی پیشانی پر ایک پیار بھرا بوسہ ثبت کردیا''

اس اقتباس کے ذریعہ ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ خاتون جو کہ ظاہری طور پر خوش نظر آرہی ہے لیکن اپنے بچے کی فکر اسے اندر ہی اندر ستارہی ہے۔ہمیشہ اس کے ذہن میں یہ خیال رہتا ہے کہ میرا بچہ اسکول میں ٹھیک تو ہے اس نے کھایا یا نہیں۔دوسروں کے لیے وہ صرف ایک کام کرنے والی ہے۔لیکن اس کے نازک کندھوں پر ایک بچے کی ذمہ داری ہے جو دنیا کی سب سے بڑی ذمہ داری ہوتی ہے۔جس

کی وجہ سے عورت ہر درد وغم ،تکلیف برداشت کرنے پر تیار ہو جاتی ہے۔مرد جب کوئی کام کرتا ہے تو اسے کام کہتے ہیں اور اسے داد بھی دیتے ہیں مگر وہی کام جب ایک عورت کرتی ہے اسے وہ اہمیت نہیں ملتی ہے جو ملنی چاہیے۔اس افسانے میں عورت کا دوسروں کے گھروں میں کام کرنا اس کا شوق نہیں ہے بلکہ اس پر اس کے گھر کی ذمہ داریاں اسے ایسا کرنے کے لیے مجبور کر دیتی ہے۔

ان کا اور ایک افسانہ ''محبت کے رنگ'' ہے جو ان کے افسانوی مجموعہ ''پارکنگ ایریا'' میں شامل ہے۔جس میں انھوں نے ایک لڑکی کو پیش آنے والے مسائل بیان کیے ہیں۔اس افسانے میں محبت اور رشتے کے رنگ بتائے گئے ہیں کہ محبت کے کئی رنگ ہوتے ہیں محبت کے کئی نام ہیں۔ ماں باپ سے محبت، اولاد سے محبت، دوستوں سے محبت، استاد اور شاگرد سے محبت غرض محبت کے کئی رنگ و روپ ہیں۔

اس افسانے کا مرکزی کردار ثمینہ ہے جو نہایت ہی خوش مزاج ہے۔اس کے علاوہ ماسٹر اشفاق ہے جو ثمینہ کے استاد ہیں۔کہانی مختصر یہ ہے کہ اشفاق ،ثمینہ کے استاد رہے۔ثمینہ اپنے استاد کی بہت عزت کرتی ہے انھیں عقیدت کی نظر سے دیکھتی ہے اس کی دیکھ بھال کرتی ہے اس کا خیال رکھتی ہے طرح طرح سے ان کی خدمت کرتی ہے۔لیکن ماسٹر اشفاق اس کی خدمت و محبت کو غلط سمجھتا ہے اور ایک خط کے ذریعہ اپنے پیار کا اظہار کر دیتا ہے۔جب ثمینہ کو اس بات کا پتہ چلتا ہے تو وہ کہتی ہے کہ میں آپ کی بہت عزت کرتی ہوں محبت کرتی ہوں مگر میری محبت وہ نہیں جو آپ سمجھتے ہیں۔ماسٹر اشفاق کے خط کا جواب ثمینہ اس انداز میں دیتی ہے۔ملاحظہ فرمائیں:

محترم ماسٹر صاحب!

تسلیم

آپ نے لکھا ہے کہ میں تمھیں نہیں سمجھ سکا تو واقعی آپ مجھے نہیں سمجھ سکے۔ آپ نے اپنے چہرے پر جمی میری آنکھیں دیکھ کر اوران میں محبت کی جھلک محسوس کر کے اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے لیکن آپ کو غلط فہمی ہوئی۔آپ پر مرکوز ہونے والی میری نگاہیں خلوص اور محبت سے بھری ضرور تھی مگر وہ ایک بہن کی آنکھیں تھی جو اپنے بھائی کے چہرے پر پھیلے ہوئی اداسیوں کے ڈورے اور بھیگی ہوئی آنکھوں میں تیرتے ہوئے غموں سے اس کی زندگی کے خلاء اور محرومیوں کا اندازہ کر رہی تھی۔افسوس کہ میں آپ کی خواہش کی تکمیل نہیں کر سکتی۔

آپ کی بہن

ثمینہ

اس افسانے میں محبت کے رنگ کے کئی پہلو دکھائی دیتے ہیں۔ثمینہ جو ماسٹر صاحب کو ایک بھائی کی نظر سے دیکھ رہی تھی اس کے ماسٹر صاحب نے اس کا غلط مطلب نکالا۔ جو آج کے ہمارے سماج کا حصہ ہے۔آج عورت کے لیے جو سب سے بڑے مسئلے پیش آتے ہیں وہ یہ ہے کہ عورت کو غلط نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔عورت جو گھر پر رہتی ہیں یا اسکول اور کالج جانے والی لڑکیاں ہوں ، دفتر میں کام کرنے والی خواتین ہوں ان کے ساتھ بھی یہ مسائل پیش آتے ہیں ۔ان مسائل سے خوف کھانے کے بجائے ڈٹ کر مقابلہ کرنے کی ہمت وحوصلہ ہمیں غضنفر کے افسانوں میں دکھائی دیتا ہے۔

مجموعی اعتبار سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ غضنفر کے افسانوں میں عورتوں کی حیثیت اور ان کے سیاسی ،سماجی ،اخلاقی مسائل کی عکاسی نمایاں طور پر ملتی ہے۔

غضنفر علی اردو ادب کی خدمت کرنے میں آج بھی بے حد مصروف نظر آتے ہیں۔ان کی شہرت ومقبولیت ان کے فن کا پختہ پن ہے۔وہ کہانی بننے کے طریقۂ کار سے بخوبی واقف ہیں۔زبان و بیان نہایت سادہ اور سلیس ہوتا ہے۔استعاروں وعلامتوں سے گریز کرتے ہوئے سماج کے مسائل کی عکاسی اپنی تحریر میں نمایاں کرتے ہیں۔کم سے کم الفاظ میں اپنی بات مکمل کرنے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں جس سے ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں زبان پر بے پناہ عبور حاصل ہے۔

*****

کتابیات

بنیادی ماخذ:

(1) کوئلے سے ہیرا	(ڈرامہ)	1971
(2) مشرقی معیار نقد	(تنقید)	1978
(3) پانی	(ناول)	1989
(4) کینچلی	(ناول)	1993
(5) کہانی انکل	(ناول)	1997
(6) دویہ بانی	(ناول)	2000
(7) زبان وادب کے تدریسی پہلو	(تنقید)	2001
(8) فسوں	(ناول)	2003
(9) وش منتھن	(ناول)	2004
(10) تدریس شعروشاعری	(تنقید)	2005
(11) حیرت فروش	(افسانوی مجموعہ)	2005
(12) مم	(ناول)	2007
(13) لسانی کھیل	(درس وتدریس)	2007
(14) شوراب	(ناول)	2009
(15) سرخ رو	(خاکوں کا مجموعہ)	2010
(16) مانجھی	(ناول)	2012

(17) فکشن سے الگ	(تنقیدی مضامین کا مجموعہ)	2013
(18) روئے خوش رنگ	(خاکوں کا مجموعہ)	2014
(19) پارکنگ ایریا	(افسانوی مجموعہ)	2015
(20) آنکھ میں لکنت	(شعری مجموعہ)	2015
(21) سخن غنچہ	(شعری مجموعہ)	2015
(22) مثنوی کرب جاں	(مثنوی)	2016
(23) خوش رنگ چہرے	(خاکوں کا مجموعہ)	2018

ثانوی ماخذ

1	ابواللیث صدیقی	اردو افسانہ آج کا اردو ادب	دہلی	1975
2	احمد صغیر	اردو افسانہ کا تنقیدی جائزہ 1980 کے بعد	دہلی	2009
3	اختر اقبال	جدید افسانہ تجربہ اور امکانات	دہلی	2007
4	اسلم جمشید پوری	جدیدیت اور اردو افسانہ	دہلی	2001
5	پرویز شہریار	منٹو اور عصمت کے افسانوں میں عورت کا تصور	دہلی	2011
6	تبسم فاطمہ	لیکن جزیرہ نہیں	دہلی	1994
7	ترنم ریاض	بیسویں صدی میں خواتین کا اردو ادب	دہلی	2004
8	خلیل الرحمٰن اعظمی	اردو میں ترقی پسند	علی گڑھ	1989
9	سید عاشور کاظمی	بیسویں صدی کے اردو نثر نگار مغربی دنیا میں	دہلی	2002
10	سلیم شہزاد	قصہ جدید افسانے کا	مہاراشٹرا	1989

11 شمس الرحمٰن فاروق	افسانے کی حمایت میں	دہلی	2006
12 شمس الرحمٰن فاروق	جدیدیت کل اور آج	دہلی	2007
13 صادقہ نواب سحر	خلش نے نام سہی	دہلی	2013
14 صغیر افراہیم	اردو افسانہ ترقی پسند تحریک	علی گڑھ	2009
15 طارق چھتاری	جدیدیت تحریک سے قبل افسانہ	ممبئی	2014
16 عائشہ سلطانہ، ڈاکٹر	مختصر اردو افسانے کا سماجیاتی مطالعہ	دہلی	2006
17 عبادت بریلوی	اردو تنقید کا ارتقا	دہلی	2010
18 عذرا نقوی	آنگن جب پردیس ہوا	دہلی	2001
19 غضنفر اقبال	اردو افسانہ 1980 کے بعد	کرناٹک	2006
20 قمر رئیس، پروفیسر	نیا افسانہ	دہلی	2001
21 قمر رئیس، پروفیسر	اردو میں بیسوی صدی کا افسانوی ادب	دہلی	2004
22 قمر رئیس، پروفیسر	نیا افسانہ مسائل ومیلانات	دہلی	1992
23 قیام نیر، ڈاکٹر	بہار میں اردو افسانہ نگاری	دہلی	1996
24 گوپی چند نارنگ	اردو افسانہ روایت اور میلانات	دہلی	2000
25 گوپی چند نارنگ	بیسویں صدی میں اردو ادب	دہلی	2002
26 گوپی چند نارنگ	اردو افسانہ روایت اور مسائل	دہلی	2000
27 گوپی چند نارنگ	نیا اردو افسانہ	دہلی	1988
28 گیان چند جین	اردو نثر کی داستانیں	لکھنؤ	1987

29	مجید مضمر	اردو کا علامتی افسانہ	دہلی	1990
30	مرزا حامد بیگ	اردو افسانے کی روایت	دہلی	2014
31	مشرف عالم ذوقی	لینڈ اسکیپ کے گھوڑے	دہلی	2004
32	نکہت ریحانہ	اردو مختصر افسانہ: فنی و تکنیکی مطالعہ	دہلی	1986
33	وقار عظیم	نیا افسانہ	علی گڑھ	1996
34	وقار عظیم	فن افسانہ نگاری	علی گڑھ	1997
35	وقار عظیم	داستان سے افسانے تک	دہلی	1994
36	ہمایوں اشرف	عبدالصمد عکس در عکس	دہلی	2008
37	یاسمین فاطمہ	جدید اردو افسانے میں عصری حسیت	حیدرآباد	1987

رسائل و جرائد

1	آج کل	نئی دہلی	جنوری	2009
2	اسباق	پونیہ	جولائی	2017
3	ایوان اردو	دہلی	دسمبر	1989
4	سب رس	حیدرآباد	مارچ	2016
5	شاعر	ممبئی	مارچ	2012
6	شعر و حکمت	حیدرآباد	اپریل	2013

*****